ماہنامہ

قومی زبان

انجمن ترقیٔ اردو کا ترجمان
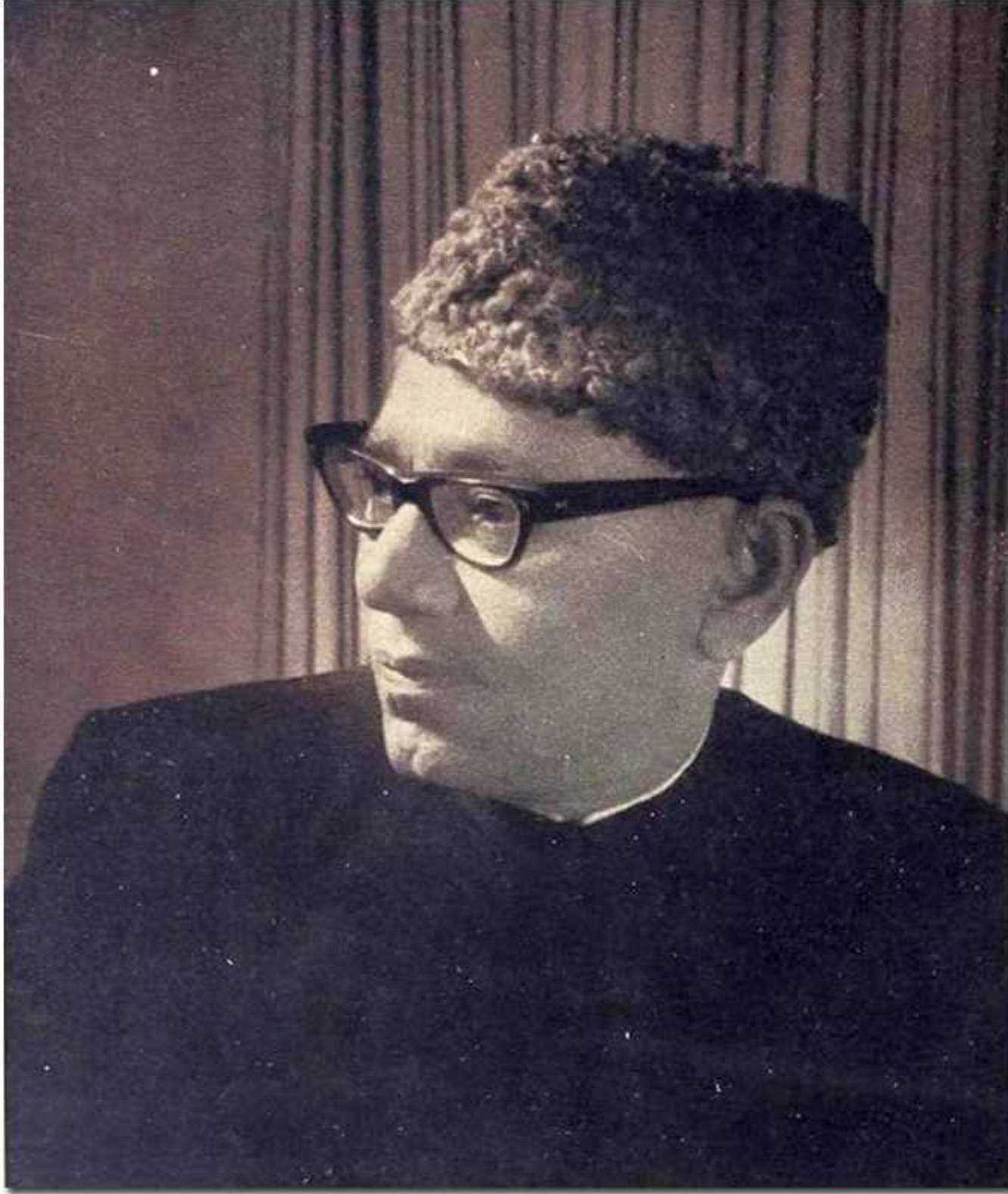
شاہد احمد دہلوی مرحوم

انجمن ترقی اردو

اردو روڈ کراچی

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

جلد ۳۱ شمارہ - ۱

جولائی ۱۹۶۷ء

بیاد شاہد احمد دہلوی

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

زیرِ تعمیر اُردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیرِ تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار چھ سو اکیاسی روپے تراسی پیسے (۱،۶۶،۶۸۱ روپے ۸۳ پیسے) جمع ہو چکے ہیں۔ ذاتی طور پر عطیہ دینے والے اور رسائد کی فروخت سے رقم جمع کرانے والے حضرات اور اداروں کے نام مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ گزشتہ ایک ماہ میں جو عطیات وصول ہوئے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے:-

ذاتی عطیات

۱۔	شبیر اینڈ کمپنی		ایک ہزار روپے ۱۰۰۰
۲۔	جناب میر علی بخش صاحب تالپور (بذریعہ جناب فیروز عباسی)	پیر گوٹ۔ میرپور خاص	ایک سو روپے ۱۰۰
۳۔	جناب میر غلام رسول (" " ")	پیر گوٹ۔ میرپور خاص	ایک سو روپے ۱۰۰
۴۔	چیرمین ڈسٹرکٹ کونسل کراچی		پچیس ۲۵ ہزار روپے
۵۔	شیر فارم کراچی بذریعہ یعقوب پٹیل صاحب		مبلغ ایک ہزار روپے

رسائد کی فروخت سے مندرجہ ذیل حضرات نے رقوم جمع کرائیں

۱۔	جناب شیخ اکرام صاحب		چار ہزار چار سو نوے روپے
۲۔	جناب فیروز عباسی صاحب	کراچی	ایک ہزار ایک سو پچاس روپے
۳۔	جناب علی اصغر صاحب۔ چیف سیکریٹری حکومت مشرقی پاکستان		مبلغ چھ سو روپے
۴۔	جناب عبدالحمید غوری صاحب	کراچی	بیس روپے
۵	جناب خلیل اللہ صاحب وائس پرنسپل	اردو کالج کراچی	ایک سو روپے
۶	شیر فارم کراچی بذریعہ جناب یعقوب پٹیل صاحب		مبلغ پانچ سو روپے
	محترمہ عطیہ زہرہ بنت شریف احمد قریشی صاحب اردو کالج کراچی		مبلغ گیارہ روپے

اثر لکھنوی

جناب اثر لکھنوی کی وفات (۶؍ جون ۱۹۶۷ء) اردو ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس سانحے نے اُردو زبان اور ادب کو ایک ایسے محسن اور بزرگ سے محروم کر دیا، جس نے تقریباً نصف صدی تک علم و ادب کی خدمت کی۔ وہ صفِ اول کے شعراء اور نقادوں میں سے تھے۔ ان کی سخن وری اور سخن فہمی نے جہاں ہمارے ادب میں قابلِ قدر اضافے کئے وہیں بہت سے نئے ادیبوں کی ذہنی تشکیل میں بھی حصّہ لیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک ادبی رہنما تھے، خصوصاً زبان کے سلسلے میں ان کی سخت گیری ناقابلِ فراموش تھی اور وہ اس ضمن میں بڑے سے بڑے ادیب کو ٹوکنے سے بھی احتراز نہ کرتے تھے۔

اثرؔ صاحب جیسے بزرگ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں، ایسے بزرگوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ اُنھیں کی طرح ادب و زبان کی خدمت کی جائے۔

شاہد احمد دہلوی

رسالہ ساقی کا آخری اداریہ

نگاہِ اوّلیں

حملہ تو بڑا سخت ہوا تھا مگر زندگی تھی، بچ گیا۔ خدمت کرنے کی کچھ اور مہلت مل گئی۔ رسم دُنیا تو یہ ہے کہ پکّی عمر والوں کو چھٹی دے دی جاتی ہے کہ وہ باقی عمر سکون سے گزار دیں۔ مگر شاید ادب کی نوعیت بھی عشق جیسی ہے کہ ع

اُس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

تقریباً سبھی عیادت کرنے والوں نے اس نیک خواہش کا اظہار کیا ہے کہ مجھے طویل عمر ملنی چاہیئے تاکہ اردو ادب کی خدمت ہوتی رہے۔ خود اپنا بھی یہ حال ہے کہ ؎

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

جیتے جی تو میں ادب سے قطع تعلق کر نہیں سکتا۔ مگر سدا کون جیا ہے؟ اس لئے ذرا اس پر بھی غور کر لینا چاہیئے کہ

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

(ساقی۔ اپریل ۱۹۶۷ء)

شاہد احمد دہلوی

خود نوشت

مغل بادشاہوں کا آفتاب جلال غروب ہو رہا تھا۔ دلّی کے لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع جھلملا رہی تھی۔ بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ فرنگیوں سے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی، وہ بھی اس شرط پر کہ ان کے بعد تاج و تخت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ مگر ہاتھی مرے پیچھے بھی سوا لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ اس مردہ حالت میں بھی تیموری جاہ و جلال کا وقر بہت کچھ باقی تھا۔ لال حویلی تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور شہر بہت کچھ اجڑ جانے پر بھی علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بھانت بھانت سے لوگ کھنچے چلے آتے اور اپنی مرادیں پاتے۔ شہری آبادی کے یہی شب و روز تھے کہ سات سال کا ایک لڑکا تحصیل علم کے شوق میں بجنور سے دلّی آیا۔ سے دلّی آیا اور پنجابی کٹڑے کی مسجد کے طالب علموں میں شامل ہو گیا دوسرے طالب علموں کی طرح یہ لڑکا بھی محلّے کے گھروں سے روٹی مانگ لاتا اور روکھی سوکھی جو میسر آتی خدا کا شکر ادا کر کے کھا لیتا۔ رات کو کڑکڑاتے جاڑوں میں مسجد کی صفوں میں لپٹا پڑا سو جاتا۔ اگر کسی دن جلدی آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا ملّا ایک لات رسید کرتا اور لڑکا لڑھکتا ہوا چلا جاتا اور ساتھ کے ساتھ صف بھی بچھ جاتی۔ دن بھر اور رات گئے تک اس لڑکے کو بس پڑھنے سے کام تھا۔ علم کی لگن میں صبر و شکر سے تمام سختیوں کو جھیلتا رہا۔ غریب کا بچہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ شوق اور ذہانت کے پَر اسے اڑائے لئے چلے گئے۔ مکتب سے نکل کر دلّی کالج میں پہنچا اور یہاں سے سند لینے کے بعد ترقی کی راہیں اس پر کھل گئیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر جا پہنچا۔ اس زمانے میں یہ آخری بڑا عہدہ تھا جو فرنگی راج میں کسی دیسی کو مل سکتا تھا۔ اتنے ہی میں سر سالار جنگ نے انہیں جانچ کر حیدرآباد بلا لیا اور یہ صاحب اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اونچے سے اونچے مرتبوں تک پہنچے۔ اللہ نے عزت بھی دی اور بے تحاشہ دولت بھی۔ اخلاقی اور مذہبی کتابیں لکھنے کی وجہ سے نیک نامی اور شہرت بھی ملی۔ آپ سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے ڈپٹی نذیر احمد جن کی کتابیں اور ترجمۂ قرآن گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔ ان ڈپٹی نذیر احمد کے اکلوتے بیٹے تھے بشیر الدین جن کی ابتدائی تعلیم خود شفیق باپ کے سائے میں ہوئی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد میاں بشیر بغرض ملازمت دکن چلے گئے اور اول تعلقداری سے وظیفہ یاب ہوئے۔ یہ بھی اپنے نامی گرامی والد کی طرح بہت بڑے مصنف اور مورخ تھے۔ ادبی اور اخلاقی کتابوں کے علاوہ دو ضخیم جلدوں میں تاریخ بیجا پور اور تین بڑی جلدوں میں تاریخ دہلی لکھی۔ یہ ان کے دو بڑے تحقیقی کارنامے ہیں۔ جب تک زندہ رہے ان کے ہاتھ سے کبھی قلم نہیں چھوٹا۔

میاں بشیر کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں دہلی کے ایک معزز خاندان میں ہو گئی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا مگر پندرہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میاں بیوی تو اس محرومی پر بھی مطمئن و قانع تھے مگر پندرہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میاں بیوی تو اس محرومی پر سبھی صدائیں پڑنے لگیں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں نکاح ثانی کے وہ خلاف تھے مگر جب چاروں طرف سے ان پر عزیزوں کا دباؤ پڑا اور انہوں

نے خاندان کا چراغ گل ہوتے دیکھا تو وہ بھی پسیج گیا۔ بیٹے اور بہو میں بڑا پیار دلار تھا بیٹے سے کیسے کہیں کہ اپنی چہیتی بیوی پر سوکن لے آ۔ میاں بشیر کی والدہ سے کہا کہ تم سمجھاؤ۔ انھوں نے بیٹے کو چمکار پچکار کر رضامند کیا۔ اور ایک غریب مگر شریف خاندان کی ایک سیدانی سے چپ چپاتے ان کا نکاح پڑھوا دیا۔ اللہ کی شان کہ ان سیدانی سے بھی دس سال تک اولاد نہیں ہوئی۔ بڑی دلہن کی بن آئی اور انھوں نے طعنوں تشنوں سے جان ضیق میں کر دی جب معاملہ تنت پر پہونچ گیا تو چھوٹی دلہن کی کوکھ ہری ہوئی۔ خاندان کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ اللہ نے چاند سا بیٹا دیا۔ دنوں اس کی خوشی منائی گئی۔ ڈپٹی صاحب نے پوتے کا نام منظر احمد رکھا۔ اس کے بعد تو خدا کی دین ایسی ہوئی کہ یکے بعد دیگرے تین لڑکے ہوئے۔ منجھلے کا نام مظہر احمد اور سنجھلے کا شاہد احمد رکھا گیا۔ اب ان سنجھلے صاحب زادے میاں شاہد احمد کی مختصری سرگزشت حیات سنئے اور خود انہی کی زبانی سنئے۔

میں ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو دلی میں، اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوا۔ چار سال کی عمر سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ ابا جب حیدرآباد سے دلی آتے تو سب سے پہلے ہمیں دادا ابا کی خدمت میں لے جاتے۔ ابا دادا ابا سے بغلگیر ہو کر رونے لگتے اور ہم حیران ہو کر انہیں تکتے رہتے۔ پھر دادا ابا ہمیں ایک ایک اشرفی دیتے اور ہم چپکے سے وہاں سے کھسک لیتے۔ بس اور کچھ یاد نہیں ہے۔

جب میں چھ سال کا ہوا تو چھوٹی بہن صفیہ حیدرآباد میں پیدا ہوئی۔ انہی دنوں ابا کو کسی ضروری کام سے دلی جانا پڑا۔ ادھر ابا دلی روانہ ہوئے ادھر اماں کی طبیعت ایکا ایکی خراب ہوئی۔ اس کی اطلاع فوراً بذریعہ تار ابا کو دی گئی۔ وہ الٹے قدموں دلی سے لوٹے مگر جب حیدرآباد پہنچے تو اماں کا جنازہ صحن میں رکھا پایا۔ اچھا بھلا چھوڑ گئے تھے، یہ کیا ہوا؟ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ کسی نے لپک کر انہیں تھام لیا۔ ابا بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے۔ آنسو پیتے رہے۔ اماں کو سپرد خاک کرنے کے بعد آنسوؤں کا سیلاب ضبط کے بند کو بہالے گیا۔ اور وہ ہم بچوں کو گلے لگا کر روتے رہے اس سے ان کے دل کی بھڑاس نکل گئی، مگر ساری عمر جب بھی انہیں اماں کا خیال آجاتا تھا رونے لگتے تھے۔ ماں کی کمی پوری کرنے کے لئے ابا نے ہم پر یورپین اور اینگلو انڈین گورنسیں رکھیں اور ہمیں اچھے سے اچھے کانونٹ اسکولوں میں تعلیم دلائی۔ گھر پر بھی ماسٹر پڑھانے آتے اور ابا خود بھی ہمیں انگریزی اور اردو پڑھاتے تھے۔ پھر ایک دفعہ ابا دلی آئے تو بسلسلہ مجتبائی میں مولوی عبدالاحد کے ہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیا جائے۔ ۱۹۱۹ء میں ہم تینوں بھائیوں کو ایم۔ اے۔ او اسکول علی گڑھ میں داخل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں بچوں کا بورڈنگ ظہور وارڈ تھا۔ تقریباً تین سال ہم نے علی گڑھ میں پڑھا۔ اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا اور مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قائم کیا ابا نے ہمیں علی گڑھ سے اٹھا لیا۔ وہ حیدرآباد سے پنشن لے کر دلی آگئے تھے۔ ہمیں عرب اسکول میں داخل کر دیا۔ ۱۹۲۳ء میں دلی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے لاہور جا کر ایف۔ سی کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے ایف۔ ایس۔ سی (میڈیکل) پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ مری ہوئی لاشوں پر کام کرنے سے طبیعت اس قدر مکدر اور بےزار ہوئی کہ ایک سال ہی میں وہاں سے بھاگ لیا۔ دلی آکر میں نے انگریزی ادبیات میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لی۔ اس سے ایک سال پہلے ابا کا انتقال فالج میں ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے لئے پچاس پچاس ہزار روپیہ نقد اور دو سو روپے ماہانہ کی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ اس لئے کمانے دھمانے کا ہمیں کوئی فکر نہ تھا۔ میں نے فارسی ادبیات میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔ میرے ایک رشتے دار کے بھانجے ہیں انصار ناصری جو میرزا عمر علی صاحب "مصلائے عام" کے پوتے ہیں انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ دلی سے ایک عمدہ ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ میری سمجھ میں یہ بات آگئی اور بغیر کسی تجربے یا مشورے کے جنوری ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ "ساقی" جاری کر دیا۔ کوئی چار پانچ سال کی اثنا میں

اس پرچے نے اپنی جگہ تو بنالی مگر میرے ماموں نے جو اس پرچے کا اہتمام کرتے تھے، مجھے بتایا کہ اس پرچے پر پچیس تیس ہزار روپیہ ضائع ہو چکا ہے، اور اگر یہی روش رہی تو باقی روپیہ بھی یونہی نکل جائیگا۔ ادھر بھائیوں نے بھی لعنت ملامت کی تو آنکھیں کھلیں۔ پرچے کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا اور کچھ ادیبوں کی کتابیں چھاپنی شروع کیں۔ ڈوبتا ہوا کاروبار تیر گیا اور ۱۹۴۷ء میں ساقی بکڈپو کی مالی حیثیت دو لاکھ کی تھی، اور پندرہ ہزار روپیہ ادیبوں اور شاعروں کی طرف بطور پیشگی باقی تھا۔ مگر حاشیہ نفس بڑی مشکل چیز ہے اور میرے لئے خود ستائی اس سے بھی زیادہ مشکل۔ لہٰذا ایک کرم فرما کے دو خطوں کے اقتباس درج کرتا ہوں تاکہ آپ کو میرے کچھ وہ حالات بھی معلوم ہو جائیں جنہیں میں خود بیان نہیں کر سکتا۔ یہ خطوط راجہ مہدی علی خاں کے ہیں، اور حال ہی میں موصول ہوئے ہیں ـــ

' ہزاروں سال پہلے، جب آپ دلی سے کھو گئے تھے، اور آپ کی زندگی کے ـ ـ ـ بارے میں خدانخواستہ بری بری افواہیں پھیل رہی تھیں، یہاں کے بہت سے دوست آپ کے لئے بے حد متفکر اور دست بدعا تھے۔ بہت عرصہ بعد ایک دن معلوم ہو گیا کہ آپ بفضل خدا خیریت سے ہیں اور پاکستان میں ہیں۔ اس کے بعد میں مست ادب نگار ہو کر فلمی دنیا کی معروفیات میں بہت بری طرح کھو گیا۔ اور اس وقت بھی کھویا ہوا تھا۔ جب مجھے عزیز دوست منٹو کی خبر موصول ہوئی مجھے بے حد شرمندگی تھی کہ اس دوران میں میں نے منٹو کو بھی صرف دو ایک خط لکھے، اور وہ بھی ان کے خطوط کے جواب میں سالہا سال گزر گئے لیکن میں نے پاکستان و ہندوستان کے کسی شاعر یا ادیب دوست کو کوئی خط نہ لکھا آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل " بستر مرگ " پر میری ادبی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ پچھلے پرچوں میں سے کون سے زندہ ہیں کون سے مر گئے۔ اسی جستجو و تلاش کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ کراچی سے " ساقی " شائع ہوتا ہے میرا حافظہ ٹھیک نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ ایک خط میں نے آپ کو بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد میں پھر بھول گیا۔ ایک مرتبہ ایڈیٹر نقوش کو بھی خط لکھا۔ نقوش میرے نام جاری ہو گیا۔ شاید آپ ہی نے جاری کرایا ہو۔ یہ پرچہ اب بھی باقاعدگی سے میرے نام موصول ہوتا ہے۔ اور آپ کی اعلیٰ ظرفی اور میری کم ظرفی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ ایک دن نقوش میں نقوش کے سلسلے میں آپ کا مضمون پڑھا تو حافظہ مجھے کئی سال پیچھے کی طرف لے گیا دلی کی دوسری پرانی یادیں تازہ ہونے کے علاوہ ـ وہ گھڑیاں آنکھوں میں پھر گئیں جو کبھی آپ کے پاس گزاری تھیں۔ اور یکایک خیال آگیا کہ جس طرح بعض دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے آپ کام آیا کرتے تھے میری زندگی کا رُخ بدلنے میں بھی خدا کے بعد آپ ہی کا ہاتھ تھا ـــ مجھے فلم انڈسٹری میں داخلہ آپ کے صرف ایک خط سے مل گیا جو آپ نے میرے لئے منٹو مرحوم کو لکھا تھا اسی قسم کے ایک سفارشی خط کی درخواست میں نے اپنے ماموں جناب حامد علی خاں صاحب سے بھی کی تھی اگرچہ انہیں ریڈیو میں لانے والا بھی میں ہی تھا، مگر انہوں نے مجھے سفارشی خط دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ ہی میرے کام آئے آج میں جو کچھ ہوں وہ سب کچھ آپ کے طفیل سے حاصل کیا ہے آپ کے اس احسان کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا ـ

اتنے عرصے کے بعد آپ کا گرامی نامہ موصول ہو کر بے حد مسرت کا باعث ہوا۔ لیکن جب آپ کے اور " ساقی " کے حالات معلوم ہوئے تو میری یہ تمام خوشی رنج و غم میں تبدیل ہو گئی۔ بہت دیر تک بہت دنوں تک میں پریشان و مغموم رہا اور اس وقت بھی ہوں ـ

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی کوئی ادیب، کسی بہت بڑی مالی پریشانی میں مبتلا ہوا۔ بھاگا ہوا آپ کے دروازے پر پہنچا اور ہنستا ہوا واپس آگیا۔ کہ میں اپنا مسودہ شاہد صاحب کو دیکر پیسے لے آیا ہوں شاہد احمد کا در ایک ایسا در تھا جس سے ہر وقت ضرورت مند ادیبوں کی ضرورتیں خدا پوری کر دیا کرتا تھا۔ آہ وہ " بیٹھک " لٹ گیا ـ وہ " خزانہ " پامال ہو گیا ـ

مجھے وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں دہلی ریڈیو پر اسٹاف آرٹسٹ تھا۔ ایک مرتبہ میرے پاس کپڑے ختم ہو گئے تھے۔ کچھ مقروض بھی تھا۔ میں "مضراب" کا مسودہ لے کر آپ کے پاس پہنچا آپ نے پوچھا "کیا چاہیئے؟ میں نے کہا" میری ضرورتیں اس وقت تین سو روپے میں پوری ہو جائیں گی۔ ایک منٹ کے توقف کے بغیر آپ نے تین سو روپے لاکر مجھے دے دیئے بحیثیت ایک پبلشر اور کاروباری آدمی کے آپ کو مجھ سے کہنا چاہیئے تھا کہ بھائی دو سو روپے لے لو۔ ڈھلائی سو میں سودا ہو جاتا لیکن آپ نے مجھے فوراً وہ رقم دے دی جب میں نے کہا" رسید" آپ نے کہا" پھر دیکھا جائیگا اور آپ نے مجھ سے کبھی اس رقم کی رسید تک لینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

آج سے تقریباً پندرہ سولہ برس پہلے تین سو کی رقم اتنی حقیر نہیں سمجھی جاتی تھی جتنی آجکل یہ رقم میرے بہت سے کاموں میں صرف ہوئی۔ غرضیکہ سینکڑوں ادیبوں کے لئے شاہد احمد کا دربار بارہ برس تک در حاتم بنا رہا۔ وہی شاہد احمد آج خود ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ ہے اور صرف ساڑھے چار سو روپے ماہوار پا رہا ہے حالانکہ ایسے کئی ساڑھے چار سو ہم لوگ اس سے چھین لے جایا کرتے تھے۔ زندہ باد شاہد احمد جو کبھی دلی کا رونق تھا۔ دلی ادب کا گہوارہ تھا۔ دلی کا دربار تھا دلی کا بادشاہ تھا ہر شاعر ہر ادیب کے لبوں پر اسکا نام اسطرح رہتا تھا کہ نام لینے والے پر کہے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

ہم لوگوں کی یہ بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ دونوں ملکوں کا یہ صاحب طرز انشاپرداز، واحد زباں داں۔ آج اس طرح گوشہ نشینی، کی زندگی بسر کر رہا ہے، اور ہم لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی کہ شاہد احمد کا" مشغلۂ روزگار" موسیقی کی تعلیم ہے۔ مجھے بالکل یوں معلوم ہوتا ہے جیسے برنارڈ شا ریوڑیاں بیچ رہا ہو، یا شیکسپیر نے "نان اور کباب" کی دکان کھول لی ہو۔

میوزک کوئی گھٹیا چیز نہیں۔ نہ میوزک سے دلچسپی لینا گھٹیا پن ہے، (میں خود میوزک ہی سے کماتا ہوں) لیکن میوزک کے جاننے والے تو ملک میں اور لوگ بھی ہیں۔ شاہد احمد ہندوستان اور پاکستان میں صرف ایک ہے اس، صرف ایک، کا ہم صحیح قدر نہیں کر رہے۔ اس" صرف ایک" کو ہم نے نہیں پہچانا۔ اسی" صرف ایک" سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی" صرف ایک" کی عظمت سے ہم واقف نہیں۔ خیر ہیرا یا موتی کسی بہت سے خوبصورت الماری میں رکھا ہو یا کسی معمولی طاق میں اس کی قدرو قیمت یا اس کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب بھی ہزاروں لوگ ایسے ہیں، جن میں خود راجہ مہدی علی خاں جیسی حقیر ہستی بھی شامل ہے، جو شاہد احمد سے مصافحہ کر لینا بھی اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ بلکہ میری تو خدا سے دعا ہے کہ اے خدا اگر تو مجھے شاہد احمد جیسے عظیم الشان، نیک دل، خدا ترس انسان کے قدموں کی خاک کا درجہ بھی عطا فرما دے تو میں سمجھوں گا مجھے عمر کی عبادت کا حد سے زیادہ صلہ مل گیا۔ آپ میرے محسن ہیں آپ کی وجہ سے میں فلم انڈسٹری میں آیا۔ موٹریں خریدیں بے شمار دولت کمائی، نام پیدا کیا۔ اور مجھ خود غرض انسان نے کبھی آپ کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ مجھ میں اور شاہد احمد میں کتنا فرق ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ مرنے سے پہلے میں شاہد احمد جیسے انسان کو پہلے سے بھی زیادہ اونچی بلندیوں پر دیکھ لوں، بلندیوں سے میرا مطلب دنیوی بلندیاں ہیں۔ شاہد صاحب میں آپکے ان دوستوں میں سے ایک ہوں جو آپ سے بہت کم ملے۔ جو آپ کی صحبتوں میں بہت کم MIX ہوئے لیکن ہمیشہ دل و جان سے آپ کے گرویدہ رہے۔

شاہد بھائی، یقین مانئے، آپ اپنی بہت سی قیمتی چیزیں تو یہاں چھوڑ گئے۔ لیکن آپ کی ایک نہایت ادنیٰ سی چیز بھی یہاں رہ گئی جس کا شاید آپ کو خیال تک نہیں۔ وہ چیز ہے راجہ مہدی علی خاں کاش اس آدمی کو پھر آپ کے قدموں کا قرب حاصل ہو سکے۔ آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر مجھ پر رقت طاری ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اور کیا لکھوں۔

"مستراب" سے حقوق ہونے پر اگر رسمی شکریہ ادا کر دوں گا تو آپ کے عظیم الشان اخلاق کی توہین ہو جائے گی۔ آپ کے خط نے مجھے PUZZLED اور کچھ حواس کر دیا ہے۔ خط لکھتے لکھتے بھی نروس ہوا جا رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ لکھتا ہی جاؤں لیکن رقت اور افسوس کے جذبات پریشان کئے دے رہے ہیں۔ یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ایک فقیر جلا وطن بہادر شاہ ظفر کو خط لکھ رہا ہے۔" [1]

دلّی کا سارا کاروبار ۱۹۴۷ء کے کشت خون کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد۔ ہم بیک بینی و دو گوش دلّی سے نکلنا پڑا۔ پرانے قلعہ میں تین دن پناہ لینے کے بعد ریل سے لاہور روانہ ہوئے۔ رات کو ٹپیالہ کے علاقہ میں ریل پر حملہ ہوا۔ آدھی ریل کٹ گئی۔ ہم سخت جان تھے بچ گئے برے حال بلکتے دھیاڑتے لاہور پہنچے۔ یہاں کی فضا راس نہ آئی۔ دس مہینے بعد کراچی آ گئے۔ ساقی دوبارہ جاری کیا مگر اب اس کا نقصان کہاں سے پورا ہوتا۔ اسی تردد میں تھا کہ ریڈیو پاکستان نے میوزک سپروائزر کی خدمت پیش کی۔ شکریہ کے ساتھ اسے قبول کیا۔ خدا جانے موسیقی کا شوق کہاں سے مجھے لگا۔ مولوی کا خاندان، دور دور تک گانے بجانے کا چرچا نہیں مگر سنتے آئے ہیں کہ اولیاء کے گھر بھوت پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی بات ہو۔ سولہ سال کی عمر سے کلاسیکی موسیقی اچھے استادوں سے سیکھنی شروع کی تھی خاندان والے ناراض تھے کہ یہ کیا بیہودہ شوق ہے۔ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم و فن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ ہاں تو ۱۹۳۶ء سے آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کر دی تھی مگر ایس احمد کے نام سے پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔ ع

یہاں کے مانداں رازے کزو سازند محفلہا

اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے استادوں میں بھی ہوتا ہے ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

میری زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ادب اور موسیقی میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی دونوں کے علم و فن کی بری بھلی خدمت کی اور خدا کے فضل سے نیک نامی کے ساتھ۔ اسی خدمت کی بنیاد پر سیٹو نے جب اپنے ممبر ملکوں کے لئے گشتی مقررین کی اسکیم منظور کی تو پاکستان کے دانشوروں میں سب سے پہلے مجھے ۱۹۵۹ء میں منتخب کیا کہ تھائی لینڈ اور فلپینز میں پاکستان کے کلچر پر ان ملکوں کے مشہور اداروں اور شہروں میں لیکچر دوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اس خدمت کو انجام دے کر اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے دور افتادہ ملکوں کو متعارف کیا۔ ۱۹۶۱ء میں خیر سگالی کا ایک وفد ہندوستان گیا تھا میں بھی اس میں تھا میں نے پاکستانی ادب و موسیقی کی نمائندگی کرنے کا فخر حاصل کیا۔ لسانی، ادبی اور موسیقی کے مذاکرات میں مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں جگہ مجھے شریک ہونے کا موقع اکثر دیا جاتا ہے۔ میں اسے نہ صرف اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت حتی المقدور ان ذرائع سے کرنا اپنا فرض اور اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔ میری ساری عمر ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے گزری۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں جن آٹھ ادیبوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کا سنگ بنیاد رکھا انہیں سے ایک میں بھی ہوں۔ بلکہ مجھے کنونشن کے داعی اور صدر ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ بہت گئی تھوڑی رہی اللہ توفیق دے کہ بقیہ عمر بھی اسی طرح بسر ہو جائے۔ ع

[illegible]

احمد ندیم قاسمی

بیادِ شاہد

لاہور کے ادبی اور تہذیبی حلقے اُداس ہیں کہ ان سے اُن کا شاہد احمد چھن گیا۔ شاہد احمد جیسے دتی کے تھے، اسی طرح کراچی اور ڈھاکہ اور لاہور کے بھی تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ یقیناً دہلوی لکھتے تھے اور یہ لفظ انہیں سجتا بھی تھا کہ انہوں نے دتی سے جدا ہو کر بھی دتی کی تہذیب، وہاں کی وضع داری، وہاں کی نجابت کو زندہ رکھا، مگر وہ دہلوی ہو کر بھی برصغیر پاکستان و ہند کے ان تمام خطوں کے شاہد احمد تھے جہاں اردو لکھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کراچی کے ایک اخبار نے بالکل درست لکھا ہے کہ شاہد احمد کا انتقال ہمارے درمیان سے اس نسل کے رخصت ہونے کا نقطۂ آغاز ہے جو پطرس اور تاثیر کے بعد دنیائے ادب پر اب تک حکمران رہی۔

میں نے اپنے شعر و افسانہ کی اشاعت کا آغاز لاہور کے رسالوں (رومان، شاہکار، ادبی دنیا، ہمایوں) سے کیا مگر فوراً بعد ساقی تک بھی پہنچ گیا کہ ان دنوں کسی شاعر یا ادیب کا ساقی میں شائع ہونا بڑی عزت کی بات سمجھا جاتا تھا۔ اس دوران خط و کتابت کے ذریعے قرب بڑھا اور جب میں ۱۹۴۲ء میں منٹو مرحوم کی دعوت پر دلی گیا تو شاہد احمد مرحوم نے میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں منٹو اور میرے علاوہ دتی کے تمام نامور ادیب موجود تھے۔ ہم سب اردو میں باتیں کر رہے تھے مگر جب منٹو اور میں آپس میں بات کرتے تو پنجابی میں کرتے۔ اس پر شاہد صاحب نے ہمیں ٹوکا اور پوچھا "جب ہم سب اردو میں بول رہے ہیں تو آپ دونوں پنجابی میں کیوں نہیں کر رہے ہیں؟" اور منٹو نے جواب دیا "یہی سوال میں آپ سے پوچھنے والا تھا کہ جب ہم دونوں، جن کے اعزاز میں آپ نے یہ پرتکلف دعوت دی ہے، پنجابی بول رہے ہیں تو آپ لوگ اردو میں کیوں باتیں کر رہے ہیں؟" میں تو منٹو کی اس برجستگی سے لرز گیا اور بعض چہروں پر میں نے ناگواری کی شکنیں بھی نمودار ہوتے دیکھیں مگر شاہد مرحوم اس بات پر بے حد محظوظ ہوئے اور اس دوران میں منٹو سے جب بھی مخاطب ہوئے، پنجابی بولنے کی کوشش کرتے رہے۔ "پان کھاؤ گے بادشاہو؟" "کیوں بادشاہو، قہوہ پیو گے کہ چاء؟" وغیرہ وغیرہ۔ شاہد احمد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور میں ان کی فراخ دلی سے بہت متاثر ہوا۔ بعد میں جب میں نے "ادب لطیف" کی ادارت سنبھالی (یہ شاید ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے) تو مرحوم نے مجھے نئے لکھنے والوں کے پتوں کی فہرست بھجوائی حالانکہ ان دنوں ان پتوں کو ادبی رسالے کا بڑا اہم راز سمجھا جاتا تھا۔ شاہد احمد مرحوم ہی نے مجھے پنجاب کے لوک گیتوں پر ساقی میں مضامین لکھنے کی دعوت دی اور یہ مضامین ساقی میں مسلسل چھپتے رہے۔ تب میں نے کنہیا لال کپور کا ایک مضمون "اہل زبان" ادب لطیف میں شائع کیا جو میری رائے میں محض دل لگی کا معاملہ تھا مگر شاہد صاحب کو غصہ آ گیا اور میری معذرت کے باوجود انہوں نے ساقی میں ایسے مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا جو "نیاز مندان لاہور" پر حملوں کی یاد تازہ کر گیا۔ میں نے ان میں سے کسی بھی مضمون کا جواب لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ شاید

(باقی صفحہ ۲۰)

جمیل الدین عالی

ادیب اور ادیب گر

میں کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتا جو شاہد احمد دہلوی سے واقف ہو اور ان کا احترام نہ کرتا ہو۔
یہ احترام ان کے سن و سال کے سبب نہ تھا اور یوں وہ بھی پورے ساٹھ کے بھی نہ ہوئے تھے۔ یہ احترام ان کی لازوال ادبی خدمات اور مضبوط کردار کے اعتراف کا اظہار تھا۔
اس چھوٹے سے مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان جیسی ہمہ گیر اور دلآویز شخصیت کا احاطہ کیا جائے نہ ان کی خوبیاں مجھ جیسوں کے خراج عقیدت کی محتاج ہیں۔ ابھی کراچی میں ان کی یاد میں ایک اجتماع ہوا جہاں کوئی دس بارہ مقررین تھے بھرا ہوا جلسہ سہ پہر سے لیکر نو ساڑھے نو بجے رات تک چلا اور کہنے والوں نے بہت کچھ کہا مگر جب ہم سب منتشر ہوئے تو محسوس ہوتا تھا کہ ان کے متعلق کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔
میں اہل دہلی سے سخت شرمندہ ہوں کہ شاہد بھائی اسکی حیثیت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے سکتا کہ جناب وہ تو "دلی والے تھے۔" دلی والے تو لاکھوں ہیں۔
میں سابق یا حال صاحبان جائداد سے بھی معذرت طلب ہوں میں اس بات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ شاہد بھائی دلی میں بڑے صاحب جائداد تھے اور یہاں آکر فکر معشیت میں مبتلا ہو گئے۔ ایسے بھی ہزاروں ہیں۔
میں اس بات کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا کہ وہ بڑی بامحاورہ زبان لکھتے تھے۔ صرف بامحاورہ زبان لکھنا بجائے خود کوئی ادبی کارنامہ نہیں۔ بہت سے لوگ بامحاورہ زبان لکھتے ہیں۔
میں تو اس بات کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں کہ وہ ایک اعلیٰ ادیب، اعلیٰ موسیقار، اعلیٰ ادیب گر، اعلیٰ مدیر، اعلیٰ مترجم اور ان سب سے بڑھکر ایک وضعدار اعلیٰ انسان تھے۔
ان کے اعلیٰ ادیب ہونے کی گواہ ان کی تخلیقات ہیں ان کی مہارت موسیقی کے گواہ ان کے ناقدین اور شاگرد ہیں ان کے ادیب گر ہونے کے گواہ بے شمار ادیب ہیں جن میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اختر الایمان، محمد حسن عسکری اور دوسرے بہت سے غیر اختلافی مشاہیر شامل ہیں۔ ان کے ترجمے تخلیقی خصوصیات رکھتے ہیں ان کی ادارت کا ثبوت "ساقی" کے فائل ہیں۔
مگر ان کے کردار ان کی وضعداری اور سیرت کے چند مثالی گوشوں کو وہی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں جنہیں ان سے کبھی نہ کبھی کوئی گہرا واسطہ پڑ چکا ہو۔ وہ قدیم دلی کی وضعداری خودداری اور بانکپن کا ایک عظیم نمونہ ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی مافوق الفطرت آدمی تھے۔ یہ بھی مطلب نہیں کہ کسی کو ان سے کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔ بابائے اردو فرماتے تھے کہ میاں وہ آدمی ہی کیا جس کا کوئی دشمن نہ ہو جس سے کوئی اختلاف نہ رکھتا ہو جسے کبھی مطعون نہ کیا گیا ہو جس سے کبھی حسد نہ کیا گیا ہو جسے کبھی طنز و استہزا کا تختہ مشق نہ بنایا گیا ہو ارے بھائی ایسا آدمی کوئی معقول کام کر سکتا ہے وہ تو ہمیشہ اپنے گھر ڈرا سہما بیٹھا رہے گا۔

شاہد بھائی ان سب منازل سے گزر چکے تھے وہ ایک مضبوط انسان تھے ان کے کچھ عقائد اور کچھ اصول تھے ایک مخصوص مزاج تھا ایک طرز فکر ایک طریق کار تھا جس سے بزرگوں اور معاصرین بلکہ خوردوں کو بھی اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔

مگر سب ان کا احترام کرتے تھے۔

طے ہوا ہے کہ رسالہ "ساقی" کا شاہد نمبر مرتب کیا جائے گا امید ہے کہ اس میں بہت سے لوگ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھیں اس وقت شاید میں بھی کچھ عرض کر سکوں۔ ساقی کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا اور کہا جائے گا خاص طور پر ان کی تخلیقات کے بارے میں اور خود ساقی کے بے مثال ماضی کے بارے میں "ساقی" جسے انہوں نے ایک زندہ اور روشن ادبی تحریک بنا دیا تھا ایسی تحریک جو دلی کی بولی ٹھولی کی محتاج نہ تھی بلکہ وہ ایسی تحریک تھی جس نے ادب اور زندگی کے رشتے کو بڑی بے باکی سے ابھارا اور بڑی کامیابی سے پھیلایا۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت کے وہ افسانے جن کے سلسلے میں شاہد بھائی پر مقدمے چلتے تھے خود شاہد بھائی کے ترقی پسندانہ مزاج کے آئینہ دار ہیں وہ شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد کے پوتے ہونے کی حیثیت سے فرور جانے جاتے تھے۔ مگر ان کی بڑائی نسبت بزرگان کی محتاج نہ تھی۔

یقیناً وہ دلی میں ایک اچھی جائداد کے مالک تھے اور ان کی آمدنی آجکل کے امراء کے برابر تھی یقیناً وہ پاکستان میں شدید ترین معاشی مشکلات میں رہے۔ لیکن ان کی ملنساری دلی میں جائداد کے بوجھ سے دبی نہ ان کے کرائے پن نے کراچی میں معاشی مشکلات سے مات کھائی۔

میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ شاہد احمد دہلوی نے معاشی ناکامیت سے گھبرا کر کسی افسر کسی وزیر کسی سیٹھ ساہوکار کی کاسہ لیسی نہیں کی اور مجھے اس پر فخر ہے۔

یقیناً یہ ہمارے معاشرے کی بدنصیبی ہے کہ وہ از خود اپنی نادرہ روزگار ہستیوں کی خدمت نہیں کرتا۔ یقیناً یہ ہماری حکومتوں کی کھلی کوتاہی رہی ہے کہ انہوں نے شاہد احمد دہلوی جیسے خادم ادب کی قرار واقعی قدر نہ کی۔ یقیناً ہمارا معاشرہ اور ہم سب مجموعی طور پر اور انفرادی طور پر اس کے ملزم ہیں کہ اپنے ثقافت کے محسنوں کی از خود خدمت نہیں کرتے۔ ہم انہیں از خود نہیں پہچانتے۔ ہم ان کی قدر و منزلت کرنے میں بھی ذاتی تعلقات اور مختلف تعصبات کا شکار رہتے ہیں ہم اپنے مفکروں، دانشوروں، فن کاروں اور ادیبوں سے دست سوال دراز کرانے کی طلب رکھتے ہیں۔ ہم حق والوں کو ان کے حق سے اس لئے بھی محروم رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے گروپ یا ہمارے صوبے کے نہیں۔ ہم سے نیازمندی نہیں برتتے۔ ہمارے گھر ہمارے دفتر بار بار نہیں آتے ہماری خوشامد نہیں کرتے ہمارے جہل کو علم ہماری خامیوں کو خوبیاں ہماری حماقتوں کو صداقتیں نہیں کہتے۔

یہ سب سچ ہے اور یہ ہماری تغیر پذیر نئی سوسائٹی کا ایک افسوسناک جزو ہے۔

مگر کیا یہ ایک قابل فخر واقعہ نہیں کہ شاہد احمد دہلوی نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وہ ایک بہت خوشحال زندگی گزارتے ہوئے آئے تھے ایک عیال دار انسان تھے۔ ہماری آپ کی طرح ہزاروں فروعیات میں مبتلا تھے۔ ان کے سامنے نہ صرف اپنی عادات کو بھلا دینے کا مسئلہ تھا بلکہ اپنے اہل و عیال

کی کفالت اپنے بچوں کی تعلیم اور اپنی سب سے بڑی خوبی یعنی اپنے فن کو زندہ رکھنے کی مہارت حاصل کرنے کے مسائل بھی درپیش تھے کوئی اور ہوتا تو کبھی کا ٹوٹ جاتا۔

وقت گزر گیا پہلے انھوں نے اپنا بچا کھچا اثاثہ ختم کیا۔ پھر ملازمت حاصل کرلی۔ اور یہ ملازمت بھی ریڈیو پاکستان کے شعبہ موسیقی میں۔

وہ روز بروز مشکلات میں مبتلا ہوتے گئے بڑھتے ہوئے مقابلوں میں بڑھتے ہوئے افسوسناک عناصر نے "ساقی" کی کاروباری حیثیت کو بالکل ختم کردیا۔ آخر میں دو چار وضعدار مشتہرین رہ گئے تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی عمر اور گرتی ہوئی صحت نے انہیں ترجموں کی محنت شاقہ کے قابل نہ رکھا۔ نئے نئے خوش تعلق اور کم نرخ مترجمین کے سبب ترجمے کا کام بھی کم ہوتا گیا۔

پچھلے ستمبر میں ان کی جوان بیاہی شیائی صاحبزادی وفات پاگئیں۔

ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا۔

انہیں دل کا دورہ پڑا۔

مگر انہوں نے اپنی ادبی عظمت اپنی مہارت یا بزرگی کے نام پر کسی فرد سے کوئی ذاتی مدد طلب نہ کی۔ وہ ایک کھرے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ دوست بھتیوں کے تھے مشفق بھتوں کے تھے ذلیل کسی کے نہ تھے۔ خوشامد کسی کی نہ کرتے تھے۔

بعض اوقات ان کی خودداری اس بوقلموں معاشرے میں عجیب اور مضحکہ خیز لگتی تھی

دو برس ہوئے میں ایک ادارے سے متعلق تھا جو چند اخباروں کا انتظام کرتا تھا۔ ایک اخبار میں ہم نے شاہد بھائی سے ایک سلسلہ شروع کرایا جو بہت مقبول ہوا۔ کچھ عرصے بعد ادارے کے نئے سربراہ نے اخبار کی "اقتصادیات" درست کرنے کے نام پر ان کا مضمون منقطع اور معاوضہ ختم کردیا۔ میں نے عرض کیا آپ ان سربراہ صاحب سے مل لیجئے۔ مجھے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا مگر میری بات رد کردی گئی۔ اب شاید وہ آپ کی شخصیت اور وجاہت کا خیال کریں۔ فرمایا اس میں شک نہیں کہ مجھے روپے کی ضرورت ہے اور میں مفت بھی نہیں چاہتا لیکن اب میں کیا کسی کے پاس جاکر کہوں کہ بھئی میں اچھا لکھتا ہوں مجھ سے لکھواؤ اور معاوضہ دو۔ وہ تو اسے احسان ہی سمجھے گا نا۔

۱۹۶۲ء میں جب انجمن ترقی اردو دوبارہ کھلی تو نئے دستور کے مطابق پہلی میقات کے لئے صدر انجمن اور معتمد کے عہدوں پر حکومت کی طرف سے تقرر کیا جانا قرار پایا۔ صدر تو جناب اختر حسین صاحب نامزد ہو رہے تھے معتمدی کے لئے قدرت اللہ شہاب صاحب نے شاہد صاحب کا نام سوچا۔ اور تجویز ہوئی کہ ایک معقول اعزازیہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان سے کہا گیا تو بولے "ابھی انجمن دوبارہ زندہ ہوئی ہے۔ گرانٹ کچھ ہے نہیں، آپ کیا کمائیں گے، کیا کھائیں گے پہلے اس کے حالات درست کیجئے۔ پھر یہ کہ اس طرح کی ملازمتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں جہاں قدم قدم پر معترضین کھڑے ہوتے ہیں۔"

ان کے ایسے واقعات بہت ہیں۔ انہیں سینکڑوں پر قیاس کر لیجئے۔

دوسری طرف۔ اسی عالم میں کہ خود پیسے کی احتیاج تھی جب منٹو کا انتقال ہوا تو ان کی بہت سی تصانیف کے دائمی حقوق ان کے پاس تھے۔ چپکے سے لاہور گئے اور بیگم منٹو کو واپس کرآئے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہت سی تصانیف انہوں نے شائع کی تھیں جب پاکستان بنا تو بیگم چغتائی بھی آگئیں۔ شاہد بھائی نے مرزا صاحب کی کتابوں کے دائمی حقوق بھی بیگم صاحبہ کو واپس کردیئے۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر

ان واقعات کو بھی سینکڑوں سے ضرب دے لیجئے۔

ان کا ایک رخ یہ تھا کہ کوئی مجبور کر دے تو دلی اور لاہور کی اور پھر کراچی اور لاہور کی ادبی جنگیں کھل کر لڑتے تھے اور دوسرا رخ یہ تھا کہ اوکاڑہ سے گلڈ کے تعاون سے حفیظ نمبر شائع کیا تو اس کی تقریب میں حفیظ صاحب کی پذیرائی، ستائش، اور خاطرداری میں پیش پیش تھے۔ کہتے تھے ادب میں اختلاف ہوتا ہے خباثت اور منافقت کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ جو جتنا بڑا ہے اسے تسلیم کرو کسی اہم معاملے میں اس سے اختلاف ہو اور وہ زیادتی کرے تو اس نے بڑے ہونے کا جو مقام ہے اس سے انکار نہ کرو۔

اردو والے شاید یہ جان کر خوش ہوں گے کہ شاہد بھائی کے تعلقات بنگلہ ادیبوں سے کم نہ تھے۔ گلڈ بننے کے بعد انہوں نے دونوں زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں جو کوششیں سرگرم کی ہیں وہ ایک قیمتی قومی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادیبوں کا کنونشن ہوا تو وہ ہماری مجلس استقبالیہ کے صدر تھے کسی نے کہا آپ خطبۂ استقبالیہ انگریزی میں پڑھیئے کیونکہ بنگلہ زبان کے ادیب بہت آئیں گے۔ کہا جناب میں تو اردو ہی میں پڑھونگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا ترجمہ بنگلہ میں کرا لیجئے۔

ان کا خطبہ چند صفحات کا تھا۔ جلسے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا سب سخت پریشان مگر وہ نہ ملے۔ آخر ابن الحسن نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا اور پھر اس انگریزی ترجمے سے بنگلہ میں ترجمہ ہوا۔ صبح جب جلسہ شروع ہونے والا تھا تو مسکراتے ہوئے میرے قریب آئے۔

"حضرت سب ٹھیک ہے۔"

"سب ٹھیک ہے۔" ہم سب سخت گھبرائے ہوئے تھے۔

"وہ میرے خطبے کا بنگلہ ترجمہ کہاں ہے۔"

"ترجمہ نہیں ملا۔ نہ جانے کون کا رکن اسے لے کر غائب ہو گیا تھا۔ ہم گھبرائے کہ اب یہ اڑ جائیں گے مگر وہ ہنسنے لگے۔

"تلاش کر لیجئے۔ اگر نہیں ملا تو میں بدمزگی نہیں ہونے دوں گا۔ انگریزی میں پڑھ دوں گا۔

مگر وہ بنگلہ ترجمہ مل گیا۔ اور انہوں نے اپنا خطبہ بڑی شان سے اردو میں ہی پڑھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب قدرت اللہ شہاب تبادلے پر ہالینڈ جا رہے تھے تو شاہد بھائی نے جو الوداعی خطبہ پڑھا وہ ان کی بے باکی اور ادیب دوستی کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ تھا۔

گلڈ سے شاہد بھائی کا رشتہ ان کی خدمات اور گلڈ والوں کی ان سے محبت اور احترام کی داستان ایک الگ موضوع ہے بلکہ کتاب گلڈ کا ایک زریں باب ہے جو الگ لکھا جائیگا میں یہاں انہیں گلڈ کے دائرے میں محدود کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ان کی ادبی شخصیت گلڈ کی تاسیس سے بہت پہلے تعمیر ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے حالات بگڑ جانے کے بعد گلڈ نے عوامی سطح پر ان کی عظمت کے پرچم کو سنبھالا اور اس کا سرکاری اعتراف بھی کرایا۔ نہیں صدر ایوب کی حکومت نے نہ صرف صدارتی تمغۂ امتیاز دیا بلکہ ایک وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ گلڈ ان کے لئے وہ کچھ نہ کر سکا جو ان کے شایان شان تھا۔ گلڈ کسی کے لئے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا جو اسکی شان اور ضرورت کے مطابق ہو۔ آخر گلڈ اسی معاشرے کی پیداوار ہے۔ ایک طرح اسی کا آئینہ تو ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ گلڈ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے اور یہ بات شاہد بھائی سے

بہتر جانتے تھے نہ صرف اس کے بانیوں میں تھے بلکہ اس کے کارکن اور عہدیدار بھی رہ چکے تھے اس کے محدودات اور وسائل سے واقف تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ ادارہ ایک شہر ایک زبان کا نہیں بلکہ پاکستان کے سب شہروں اور سب زبانوں والوں کا ہے۔ کچھ پیشہ ور معترضین انہیں بھڑکانے کی کوشش کرتے تو خود کہتے تھے کہ میاں

تمہاری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ایک حلقے میں سوال اٹھایا گیا کہ انہیں علاج کے لئے امریکہ کیوں نہ بھیجا گیا۔ اگر کہنے والے کا رخ گلڈ کی طرف ہے تو ہم عرض کریں گے کہ

دوستو موجودہ حالت میں ایسا ممکن نہ تھا لیکن گلڈ کے ریکارڈ گواہ ہیں کہ انہیں چین بھیجا جا رہا تھا جہاں وہ افریشیائی ادیبوں کی بیورو کے مہمان ہوتے اور ہانچاؤ جھیل کے کنارے چند ماہ آرام کرتے اور مزید علاج کراتے

دوستو اپنے بزرگوں کا سوگ اس طرح مناؤ کہ ان کی روح کو آرام پہنچے وہ کبیدہ نہ ہوں۔ اگر آپ گلڈ کے مخالف ہیں تو گلڈ باقی ہے بعد میں اس پر ایک نہیں ہزار اعتراض کر لیجئے گا۔ اگر کوئی صاحب مجھ سے ناراض ہیں تو میں بھی حاضر ہوں اور اپنی خطاؤں کی معافی چاہتا ہوں اور گو آپ معاف نہ کر سکیں تو ضرور سولی پر چڑھا دیجئے۔ لیکن ان کی آڑ لے کر اپنے دل کا غبار نہ نکالئے۔ پہلے ہمیں اس صف میں سکون سے شامل ہونے دیجئے۔ جو شاہد بھائی کے ماتم میں بچھی ہوئی ہے۔

دوستو جس آدمی نے زندگی بھر اپنی کج کلاہی کو ہاتھ سے نہ دیا اسے اس کی موت کے بعد کسی عنوان وجہ نزاع نہ بنائیے وہ ایک بھاری بھرکم انسان تھا اسے ہلکا پھلکا کر کے چھوڑ کر بھی نہیں گیا تھا۔

کہنے کو ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور ہم پر اعتراض کرنے والے اور کروانے والے بھی اولیا نہیں ہیں مگر ہمارا کم از کم یہ اقصہ تو یہ ہے کہ

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو جہاں میں کوئی برا نہ رہا

دوستو اللہ تعالیٰ سب کی نیتیں اور اعمال جانتا ہے۔

شاہد بھائی گئے اور اپنے کام اور کردار کی درخشاں یادیں چھوڑ گئے۔ اب یہ ان کے دوستوں اور مداحوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی سب سے بڑی یادگار "ساقی" کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں ان کے پس ماندگان کی کفالت کے لئے حکومت سے درخواست کی گئی ہے لیکن حکومت "ساقی" نہیں چلا سکتی نہ اسے حکومت کے سپرد کرنا چاہیئے۔ اگر قوم اسے اپنا سرمایہ سمجھتی ہے تو قوم ہی پر پھر اسے زندہ و تابندہ رکھنے کا فرض بھی عائد ہوتا ہے

لب ساقی پہ مکرر ہے صلا میرے بعد

انتظار حسین

اس کے مرنے سے مرگئی دلّی

اس کے مرنے سے مر گئی دلّی۔ اور بعض لوگ عجب لوگ ہوتے ہیں۔ مرتے ہیں تو لگتا ہے کہ ایک شہر مر گیا۔ غالب کے مرنے کے بعد مولانا حالی نے یہی جانا کہ دلی مر گئی۔ مگر یہ غارت زدہ شہر مرتا ہے اور پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ زندہ ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے کبھی اداروں کی شکل میں کبھی افراد کی شکل میں۔ شاہد احمد دہلوی تو سچ مچ اپنی ذات میں دلی شہر تھے۔ پھر یوں ہوا کہ شہر تو غارت ہو گیا بس شاہد احمد دہلوی رہ گئے۔

وہ لوگ اچھے رہتے ہیں جو شہر میں پروان چڑھتے ہیں مگر شہر میں جڑیں نہیں بناتے۔ بس گملے میں لگے ہوئے پودے ہوتے ہیں کہیں اٹھا کر رکھ دو لیکن شہر کے اندر آدمی اور آدمی کے اندر شہر رس بس جائے تو پھر بہت خرابی ہوتی ہے۔ قدموں کے نیچے سے شہر سرک جائے تو آدمی کٹی ہوئی پتنگ بن کر رہ جاتا ہے۔ تو شاہد احمد دہلوی بھی اب کٹی ہوئی پتنگ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دلی اجڑی تو کٹ کر پہلے لاہور کی طرف آئے مگر آخر کار کٹی ہوئی پتنگ کراچی میں جا گری اور پھر دلی کی مٹی کراچی کی مٹی میں رل مل گئی۔

اور میں یاد کرتا ہوں شروع ہجرت کی اس رات کو جب لاہور کی کنال پارک میں مجاہد کاظمی صاحب کے مکان پر کچھ لٹے لٹائے لوگ جمع تھے اور شاہد صاحب اپنا رپورتاژ، دلی کی بپتا، پڑھ کر سنا رہے تھے۔ مگر پھر یوں ہوا کہ ان کی آواز بھرا گئی۔ پھر ان کی ہچکی بندھ گئی۔

اور میں یاد کرتا ہوں ان دنوں کو جب وہ کراچی سے لاہور آتے تو بس ایک ڈیڑھ دو دن کے لئے آتے مگر شہر کا ایک راؤنڈ ضرور کرتے اور کمال وضعداری ہر جاننے والے شخص سے گھڑی دو گھڑی کے لئے جا کر ضرور ملتے انہیں بزرگ و خورد کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے ساتھ بہرحال یہ وضع نبھائی جاتی۔

ابھی جب پچھلے دنوں وہ اس شہر میں آئے تھے تو جوان بیٹی کے مرنے کا داغ سینے پر لے کر آئے تھے اور چھڑی کے سہارے چلتے دکھائی دکھائی دیتے تھے۔ پتہ نہیں وہ اس چھڑی کے ساتھ اپنی وضع کو نبھا سکے یا نہیں نبھا سکے۔

شاہد احمد دہلوی بے شک دلّی مرحوم کے وضعداروں میں تھے۔ مگر ان وضعداروں میں سے نہیں تھے کہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو تحریر میں سوائے وضعداری کے کچھ برآمد نہیں ہوتا اور رسالے کے ایڈیٹر بنتے ہیں تو رسالے کو وضعداری کی پوٹ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ادبی رسالہ اگر میدان جنگ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے اور ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، ماہنامہ ساقی میں رن ہی پڑتے دیکھا۔ آج اس فرد سے لڑائی ہے، کل اس تحریک پہ چڑھائی ہے۔

ساقی کو شاہد احمد دہلوی کی شخصیت کی توسیع جانو۔ یہاں رسالہ اور آدمی کے درمیان کم ہی کم فرق رہ گیا تھا۔ شاہد احمد دہلوی کی طرح

ساقی بھی بہت بڑا کارساز رہا ہے۔ مگر بڑائی اپنی جگہ اور وضعداری اپنی جگہ۔ اس رسالے نے یہ کبھی نہیں کیا کہ کسی لکھنے والے کا بائیکاٹ کیا ہو۔ یا کسی مکتبۂ فکر کا حقہ پانی بند کر دیا ہو۔ یاران نکتہ داں کے لئے ہمیشہ صلائے عام رہی۔ مگر یہاں کوئی وضعداری سی وضعداری تھی۔ ایک زمانہ میں تو یہ رسالہ نئے ادب کا بہت بڑا ماذ بنا ہوا تھا۔ مگر ناموں کی ترتیب میں کبھی فرق نہیں پڑا۔ پہلے میاں ایم اسلم۔ باقی منٹو، عصمت۔ کرشن اور بیدی سب بعد میں۔ بس آدمی رسالہ کو دیکھ کر بھونچکا ہی رہ جاتا تھا۔

خیر اس وضع کو آپ کچھ بھی کہیں مگر وہ وضعداری کو دیکھئے کہ ان کے پاس مختلف ادیبوں کی تصانیف کے جملہ حقوق تھے۔ مگر وہ انہیں ایسے واپس کرتے تھے جیسے شرفا مانگی ہوئی کتاب واپس کر دیتے ہیں کبھی پڑھ کر، کبھی بغیر پڑھے ہی۔ عظیم بیگ چغتائی کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ سے اظہار ہمدردی اس طرح کیا کہ ان کی کتابوں کے حقوق انہیں واپس کر دیئے تقسیم کے بعد کراچی میں جا کر رفیق حسین کی بیوہ کو تلاش کیا اور ان کی کتاب کے حقوق انہیں واپس نذر کر دیئے۔ مولانا صلاح الدین نے فرمایا کہ میرا جی کے مضامین چھپ جانے چاہئیں۔ شاہد صاحب نے کہا کہ میں تو چھاپنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ حق اشاعت آپ کے نام منتقل کرتا ہوں آپ شائع کریں۔

یہ وضعداری نہیں تھی۔ تو اور کیا تھی۔ وضعداری کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ اصل حقیقت انسانی تعلق ہے۔ آگے تو ہماری تہذیب کی اساس اسی حقیقت پر تھی۔ سو ہمارے معاشرے کا نمائندہ آدمی وضعدار بزرگ ہوا کرتا تھا۔ تو اس زمانے میں تو وضعداری ہی کی قدر تھی تاجر تو ہمارے یہاں اب پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں۔ اور شاہد صاحب کو دیکھئے کہ وضعداری اور تجارت کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔ بس یہ ان کی ایک سنک تھی۔ پرانے زمانے کا آدمی ہونے کے باوجود کبھی کبھی نئے زمانے کا آدمی بننے کی بھی کوشش کرتے اسی کوشش میں انہوں نے ایک دفعہ موٹر سائیکل خرید لی۔ مگر یہ وضعدار بزرگ خود کیسے موٹر سائیکل چلاتا۔ تو ڈرائیونگ کرتے تھے شمس زبیری اور پیچھے بیٹھتے تھے شاہد احمد دہلوی۔

اب آپ خود سوچ لیں کہ اس موٹر سائیکل کا انجام کیا ہوگا بس وہی انجام ان کے اشاعتی ادارے کا ہوا

خیر تو شاہد صاحب دلی کے وضعدار بزرگ تھے۔ بہت محبت کرنے والے، بہت شفقت کرنے والے، ان کے یہاں انسانی تعلقات بنیادی اہمیت رکھتے تھے اس سے آدمی کو تھوڑا لڑنا بھی چاہیئے، ایسا آدمی دوستوں کا دوست ہوتا ہے اور دشمنوں کا سخت دشمن ہوتا ہے جبھی تو شاہد صاحب لڑتے بہت تھے اور ایسا ویسا لڑتے وہ تو پھر سات پشتوں کی خبر لیتے تھے پچھلے برسوں میں ایک شاعر سے لڑائی ہوئی تو اس کے خلاف گولہ بارود جمع کرنے کے لئے بہار تک کا سفر کر ڈالا۔

مگر اس کا مطلب ایک اور بھی تو ہے، وہ یہ کہ شاہد صاحب انٹلکچوئل نہیں تھے، جیتے جاگتے آدمی سے واسطہ رکھتے تھے، اس لئے ان کی تحریروں میں نظریاتی بحثیں نہیں ملیں گی، ہاں تہذیب کی تصویریں نظر آئیں گی، جیتے جاگتے آدمیوں سے ملاقات ہوگی۔ ایسے آدمیوں سے جو بہت اچھے ہیں مگر بہت برائیوں سے بھرے ہوئے ہیں، اصل میں اپنے شاہد صاحب کو آدمی میں خوبیاں تو کم ہی نظر آتی تھیں۔ یا شاید وہ یوں سمجھتے تھے کہ خوبیاں تو آدمی میں ہونی چاہئیں مگر برائیاں کیوں ہیں۔ اور پھر وہ قلم اٹھاتے اور آدمی کی ساری برائیاں بکھان ڈالتے۔

اس قسم کے خاکوں پر کیا کیا ناراضگیاں نہیں ہوئیں مگر پھر سے زمانے کی بے وضعی کہہ کر بھی نہیں ٹال سکتے کیونکہ شاہد صاحب تھے تو بہت وضعدار آدمی، ایسے وضعدار کہ بچپن میں کبھی چھپ چھپا کر بیڑی پی ہوگی۔ پھر بیڑی کو چھوڑنا وضع کے خلاف نظر آیا عمر گزر گئی سگریٹ کو ہاتھ نہ لگایا ہمیشہ

بیڑی پی اور اس طرح پی کر سلگاکر دو گھونٹ لئے، پھر ہم نشیں کو پکڑا دی، تھوڑی دیر بعد دی ہوئی نعمت پھر واپس لے لی۔

پھر جس سے دوستی کی اس سے دوستی کی وضع نبھائی جس سے دشمنی کی اس سے دشمنی کی وضع نبھائی۔ بے تعلق نہ دوست سے رہے نہ دشمن سے، اور ساقی، میں جس نوجوان کو نوازا اس کی تحریر اور اس کی ڈگری، دونوں کا لوہا منوایا، ہم بہت روئے پیٹے کہ بھئی آپ ایم اے ست لکھا کریں کہ ایم اے تو پروفیسر ممتاز حسین بھی ہیں، مگر ساقی میں جس کی ڈگری لکھی گئی سو لکھی گئی۔

تو جیسا شاہد صاحب کو شروع میں دیکھا تھا، آخر وقت تک اسی طرح کا دیکھتے رہے، وہی ساقی، وہی بیڑی کا بنڈل، وہی ان کی ڈھیلی ڈھیلی اچکن اور درمیانہ موری والا پاجامہ اور وہی ایک میلی سی ٹوپی، آخر میں تو بس ایک چھڑی ہی کا اضافہ ہوا تھا۔ مگر یہ وضعدار بزرگ چھڑی کے سہارے زیادہ دن نہیں چلا، چار قدم چلکر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

(بقیہ صلا)

شاہد مرحوم کو اس کا احساس تھا۔ اسی لئے قیام پاکستان کے بعد جب ملاقات ہوئی تو اتنے تپاک اور اتنی شفقت سے ملے کہ ۱۹۴۰ء کی دلی کی یادیں تازہ ہوگئیں مجھے وہ ہمیشہ بہت محبت سے یاد کرتے تھے اس لئے جب وہ جوش نمبر مرتب کرنے میں مصروف تھے تو احباب نے مجھ پر بھی زور دیا کہ میں انہیں اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ میں ایسا نہ کرسکا کیونکہ میں ان لوگوں کی غرض دوستیوں کا انجام دیکھ چکا تھا جو شاہد احمد مرحوم کو مجھ سے کہیں زیادہ عزیز تھے، مگر چند روز پہلے جب میں نے کراچی کے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ شاہد احمد مرحوم کے تعزیتی جلسے میں حضرت جوش بھی شریک ہوئے اور انہوں نے تقریر بھی کی تو میں نے سوچا کہ اگر میں جوش کی انسانی وسیع القلبی، شاعرانہ عظمت اور فنی ہمہ گیری کا واسطہ دے کر مرحوم سے استدعا کرتا تو شاید وہ مان جاتے اور ایک ایسا کام نہ کرتے جس سے ان کے بہتر دوستوں اور عقیدتمندوں کو اتفاق نہیں تھا۔ شاہد احمد مرحوم کی ادبی سرگرمیوں سے مجھے صرف یہی اختلاف تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ اس شخص نے صحیح معنوں میں اپنی زندگی اردو زبان اور اردو کے نام معنون کر رکھی ہے اور یہی لگن یہی شیفتگی، یہی سپردگی ان کی ہر دل عزیزی کا راز ہے اور اسی وجہ سے آج برصغیر کے دوسرے شہروں کی طرح لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی صف ماتم بچھی ہوئی ہے کہ ان کے درمیان سے ایک دوست، ایک مشفق، ادب اور تہذیب اور کلچر کا ایک چلتا پھرتا نمونہ اٹھ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔

(بشکریہ جنگ)

محمد ایوب قادری

شاہد صاحب

ہماری بڑی آپا کا مکان، ہمارے گھر سے تیسری گلی میں ہے۔ پندرہویں بیسویں دن یا مہینے پیچھے وہ اکثر رات کو ہمارے یہاں آیا کرتی تھیں۔ جس رات آپا آتی تھیں وہ رات ہم چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے شب برات سے کم نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپا سے کہانیوں کا تقاضا ہوتا تھا۔ پہلے تو وہ "دہی مٹوکری تحفہ بی بی" کی کہانی سناتی تھیں۔ اس کے بعد ہم سب بچوں کا متفقہ مطالبہ ہوتا تھا کہ آپا ہم تو اصغری اکبری کی کہانی سنیں گے اول تو وہ حسب معمول ٹال مٹول کرتی تھیں مگر آخر کار اصغری اکبری کا قصہ سناتیں۔ اگر چھوٹی امت کی اکثریت ہوتی تو یہ قصہ زبانی ہوتا اور اگر چھوٹے اقلیت میں ہوتے تو باقاعدہ کتاب پڑھی جاتی۔ مسلمانوں کا وہ کونسا گھرانا ہوگا کہ جس میں پڑھی لکھی بیبیاں اصغری اکبری کا قصہ نہ پڑھتی ہوں۔ جب کتاب و مدرسے ہمارا تعلق قائم ہوا اور اردو لکھنی پڑھنی آگئی تو ہم نے اپنی آپا سے لے کر اصغری اکبری کی کتاب پڑھی۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کتاب کا اصل نام مراۃ العروس ہے اور اس کے لکھنے والے دلی کے نامی گرامی مصنف ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔

اس کتاب کا اثر تھا کہ اصغری اکبری اور محمودہ وغیرہ ہمارے خاندان میں متعارف شخصیتیں تھیں جو سگھڑ اور شعور دار بی بی یا لڑکی ہوتی تھی۔ اس کو اصغری کہا جاتا تھا اور جو پھوہڑ اور بدتمیز ہوتی تھی اس پر اکبری بیگم کی پھبتی کسی جاتی تھی۔ غرض ہمارے خاندان میں ڈپٹی نذیر احمد کی کتابیں مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح وغیرہ خوب پڑھی جاتی تھیں اور اس کا اثر تھا کہ اکثر بچیوں اور بچوں کے نام، حمیدہ، فہمیدہ، محمودہ اور سلیم وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ میری سگی دو بہنوں کے نام حمیدہ اور فہمیدہ ہیں۔

اس طرح بچپن میں ہم دلی والے ڈپٹی نذیر احمد کے نام اور ان کی کتابوں سے متعارف ہوگئے۔ ۱۹۴۳ء میں ہم نے مڈل پاس کیا اور چھٹیوں میں ہمارے قصبے کے چند نوجوانوں نے ایک کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم کیا۔ قصبہ کے پرانے خاندانوں اور باذوق حضرات سے کتابیں مانگی گئیں جو ہزاروں کی تعداد میں مل گئیں روزناموں میں انجام، وحدت، تیج، تنویر، الامان (سہ روزہ) مدینہ (سہ روزہ) اور رسالوں میں ساقی، منادی، مولوی، پیشوا، کامیاب، معارف، الفرقان، غنچہ وغیرہ آتے تھے۔ میں ساقی بالالتزام پڑھنے لگا۔ نئے پرچے کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا تھا۔ اکثر رسالے دارالمطالعہ سے گھر لے آتا تھا۔ ایک روز میں

ساقی پڑھ رہا تھا کہ میرے والد صاحب مرحوم نے پوچھا کہ میاں! کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا ساقی رسالہ پڑھ رہا ہوں پوچھا کہاں سے نکلتا ہے؟ میں نے کہا کہ دہلی سے نکلتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی صاحب نکالتے ہیں۔ اس میں افسانے بہت اچھے ہوتے ہیں ــــ اس پر والد صاحب نے فرمایا۔ معلوم ہے یہ شاہد صاحب کون ہیں؟ یہ اصغری اکبری کے بھتیجے ہیں ــــ میں خاموش! پھر فرمایا کہ اصغری اکبری والی کتاب ان کے دادا ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے لکھی ہے۔ شاہد صاحب کا قلم بھی خوب روانی دکھاتا ہے بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔ دلی میں ان سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ آدمی خوب ہیں۔ ایک لہجے میں یہ ساری تقریر ہو گئی۔ یہ ہمارا پہلا غائبانہ تعارف شاہد صاحب اور ان کے رسالہ ساقی سے تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ہم کراچی آگئے یہاں بھی ساقی ملنے لگا مگر اس میں اب وہ بات نہ تھی کہ جس کو دیکھ کر نعرہ لگایا جاتا تھا۔ الا یا ایہا الساقی ادر کا ساد ناولھا۔ لیکن بہرحال پھر بھی بہت کچھ تھا۔ ساقی پر پتہ ہوتا تھا ــــ ساقی، کراچی ۵ کئی مرتبہ خیال ہوا کہ ساقی کے مدیر شاہد صاحب سے ملاقات کرنی چاہیے مگر کوئی موقع نہ مل سکا۔ ایک روز پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا ایک علمی جلسہ تھا۔ کراچی کے بہت سے ممتاز ادیب، دانشور اور اہل قلم جمع تھے اس زمانے میں میری ملازمت کا تعلق ہسٹاریکل سوسائٹی سے تھا۔ اس جلسے میں شاہد صاحب بھی تشریف لائے تھے میں نے اپنا خود تعارف کرایا۔ فرمایا بہت خوب! میں آپ سے واقف ہوں، آپ نے وقائع عبدالقادر خانی خوب مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں دہلی سے متعلق بہت قیمتی معلومات ہیں۔ لال قلعے سے متعلق مصنف نے جو معلومات و تفصیلات دی ہیں وہ تو کہیں اور ملتی ہی نہیں۔ مگر یہ کیا کیا کہ سید الطاف علی بریلوی صاحب نے اس کا نام "علم و عمل" رکھ کے اس کی حیثیت ہی بگاڑ دی گویا مولوی اشرف علی تھانوی کی کوئی کتاب ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال و تدفین کے موقعہ پر مولوی اعجاز الحق قدوسی صاحب کے توسط سے جمیل جالبی صاحب سے ملاقات ہوئی قدوسی صاحب کی معیت میں اکثر جالبی صاحب کے یہاں جانا ہوتا اور نشست رہتی، قدوسی صاحب کی ملاقاتیں خوب جم کر ہوتی ہیں۔ قدوسی صاحب کی ملاقات کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا کہ پہلے مبین الحق صدیقی صاحب کے یہاں جھانکی مارتے، پھر شاہد صاحب کے یہاں اور آخر میں جالبی صاحب کے یہاں پہنچتے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا۔ مگر شاہد صاحب درمیان میں ضرور پڑتے تھے اور اب گویا شاہد صاحب سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

شاہد صاحب سے ملاقات بالعموم عصر کے بعد یا عشاء سے پہلے ہوتی تھی۔ بنیان پہنے، تہبند باندھے چہرے پر ایک

ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی۔ کمرے میں بالعموم تخت پر نشست ہوتی۔ یہی ان کا ڈرائنگ روم تھا اور یہی ساقی کا دفتر چند منٹ کے بعد چائے آتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم لوگ کمرے میں داخل ہو گئے ہیں اور شاہد صاحب اندر سے چار کی پیالی لئے چلے آ رہے ہیں۔ پھر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، بات ٹھہر کر آہستہ کرتے۔ جس میں متانت اور سنجیدگی ہوتی۔ خلوص، صاف گوئی اور کھرا پن ان کے مزاج میں بدرجۂ اتم تھا۔

شاہد صاحب کے پاس تبصرے کے لئے بہت سی کتابیں آتی تھیں۔ خالص ادبی کتابوں کے علاوہ وہ دوسری سب کتابیں دوستوں کو دیدیتے تھے۔ مذہبی اور تاریخی کتابیں تو خاص طور سے کسی نہ کسی کو دے ہی ڈالتے تھے اس قسم کا اکثر مال غنیمت قدوسی صاحب کے حصے میں آتا تھا ایک آدھ مرتبہ مجھے بھی حصۂ رسد ملا۔ ایک روز میں پہنچا تو فرمایا۔ خوب آئے آپ کے لئے ایک کتاب رکھی ہے، کتاب لے جائیے اس پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دیجئے۔ وہ کتاب کارخانہ نور محمد کی مطبوعہ تقویۃ الایمان" تذکیر الاخوان، حارق الاشرار، سعادت دارین، نصیحۃ المسلمین وغیرہ اصلاحی رسالوں کا ایک ضخیم مجموعہ تھی۔ میں نے تبصرہ لکھ کر دے دیا جو ساقی کے سالنامہ مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

رسالہ ساقی جنوری ۱۹۳۰ء میں دہلی سے جاری ہوا۔ شاہد صاحب نے اس رسالے کے ذریعے تہائی صدی سے زیادہ اردو ادب کی خدمت کی۔ نئے ادیبوں کی تربیت کی۔ شاہد صاحب نئی نسل کے قافلہ سالار تھے۔ ساقی میں کسی کا چھپنا استناد کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ لکھنے والوں کو معاوضہ دیتے تھے۔ کتابوں کی رائلٹی دیتے تھے۔ لکھنے والوں کو وہ معاوضہ دے کر خوش ہوتے تھے۔ کراچی میں آنے کے بعد بھی انھوں نے جس طرح ہو سکا ساقی کو باقی رکھا۔ ساقی سے شاہد صاحب کی زندگی تھی۔ ساقی میں اگرچہ یہاں خسارہ ہی خسارہ تھا مگر وہ اس کو ڈھکیلتے رہے ——— ساقی دہلی سے بڑی آب و تاب سے نکلتا تھا۔ اس کا دفتر ڈپٹی نذیر احمد کے مشہور تاریخی مکان میں تھا۔ ہمیں اس دار الادب کی زیارت کا بھی جولائی ۱۹۶۳ء میں شرف حاصل ہوا۔ میں دہلی گیا، اگرچہ میں صدر میں اپنے ایک قریبی عزیز کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر دن کا بیشتر حصہ اردو بازار میں گزرتا تھا۔ اردو بازار میں میں نے کتابوں کی ایک دوکان پر بورڈ دیکھا "کتب خانہ نذیریہ" خیال ہوا کہ غالباً شمس العلماء میاں نذیر حسین (سرخیل جماعت اہل حدیث) سے متعلق کوئی کتب خانہ ہے مگر جب اندر داخل ہوا تو میں نے تصانیف ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا بورڈ نمایاں طور سے لگا ہوا دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے متعلق ہے اور اس کے مالک محمد مسلم ایم۔ اے (شاہد صاحب کے علاتی بھائی) ہیں۔ علیک سلیک کے بعد تعارف ہوا۔ وہ کراچی کے اعزہ و احباب کو پوچھتے رہے۔ شاہد صاحب کا بھی ذکر آیا۔ پھر روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ محمد مسلم صاحب صوفی منش اور خوش عقیدہ آدمی ہیں۔ تصوف سے متعلق لٹریچر شائع کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک روز فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب والے مکان پر جس میں ساقی کا دفتر تھا، کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا تھا۔ ایک زمانے سے اس پر مقدمہ چل رہا تھا۔ آج اس کا

فیصلہ ہمارے حق میں ہوگیا ہے۔ کل کچھ احباب تشریف لائیں گے۔ آپ بھی آیئے۔ میں دوسرے دن اپنے ایک عزیز کے ہمراہ پہنچا مگر مجھے دیر بہت ہوگئی تھی اور اجتماع ختم ہوچکا تھا۔ بہرحال ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے مکان اور ساقی کے دفتر کی زیارت کی اور سید صاحب کتب خانہ نذیریہ (اردو بازار) آیا۔ مسلم صاحب نے معذرت کی اور فوراً دکان پر مٹھائی وغیرہ منگائی اور بڑے تکلف سے چائے پلائی۔

شاہد صاحب کی گفتار و رفتار، کردار و مزاج اور لباس و معاشرت میں ایک وضع داری اور مشرقی انداز تھا۔ مغربی تعلیم انھوں نے اعلیٰ پیمانے پر پائی تھی۔ مگر ان کی گفتگو سے کبھی اس قسم کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ شیروانی اور پاجامہ ان کا لباس تھا۔ چاہے کسی جلسے کی صدارت ہو یا عام شرکت، گلڈ کی کوئی بڑی سے بڑی تقریب ہو یا کسی صدر اور گورنر کی ملاقات، شاہد صاحب کا لباس وہی ہوتا۔ ایک مرتبہ وہ غالباً یونیسکو کی دعوت پر موسیقی پر چند لکچر دینے کے لئے باہر گئے مگر وہاں بھی ان کا لباس مشرقی ہی رہا۔

بات کرتے تو آہستہ آہستہ رک رک کر، ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ کھیلتی رہتی۔ صاف گوئی ان کا مزاج تھا جس میں کبھی کبھی کھرے پن تک کی جھلک آجاتی تھی۔ طول کلامی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہد صاحب، مولوی قدوسی صاحب اور میں، جالبی صاحب کے یہاں بیٹھے تھے اور محفل جمی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک صاحب تشریف لے آئے دلّی کے رہنے والے۔ گفتگو سے ان کی پھول جھڑیں، باتیں ان کی میٹھی اور سلونی۔ مگر طول کلام ان کا مزاج اور قرأت لمبی۔ وہ بولتے رہے۔ اس دوران میں شاہد صاحب بالکل خاموش رہے۔ جالبی صاحب بھی اوک گئے۔ میں اور قدوسی صاحب تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے ٹل گئے۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو پھر محفل جمی۔ دیر تک شاہد صاحب ان کی طول کلامی پر ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے رہے۔

دلی سے شاہد صاحب کو بہت محبت تھی۔ جب تک "شاہد احمد" کے ساتھ "دہلوی" کا لاحقہ نہ لگایا جائے ان کا نام ادھورا رہتا۔ ہزاروں دلی والے ہیں مگر "شاہد احمد دہلوی" ہمیشہ لکھے اور بولے جاتے۔ ساقی میں دلّی کی تہذیب و ثقافت پر کئی مضمون، مثلاً دلّی کی بہاریں، برکھارت کی بہاریں وغیرہ لکھے۔ انجام میں ایک سلسلہ "دلی جو ایک شہر تھا" لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ دلّی کی زبان تو گویا ان کی تین پشت سے خادم تھی۔ بے ساختہ لکھتے اور خوب لکھتے، دلّی کے محاورے اور روزمرہ تو ان کے نوک قلم پر رہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے سے بڑا مضمون اس طرح ادا کر دیتے تھے جیسے نگینے جڑ دئے ہیں۔

ہیں اکثر ان سے بعض محاوروں اور الفاظ کے سلسلے میں استفادہ کرتا تھا۔ شاہد صاحب سے ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ آپ نے اپنی تحریروں میں " بیاہی تیائی " کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے روہیل کھنڈ (بریلی و بدایوں وغیرہ) میں " بیاہی تھیائی " بولتے ہیں اور " تھیائی " غالباً " تھپونا " مصدر سے مشتق ہے، فرمایا ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر دلی میں اسی طرح بولتے ہیں جیسے میں نے لکھا ہے "۔ پھر میں نے عرض کیا، ایک صاحب نے " بیاہی تھیائی " لکھا ہے۔ فرمایا کہ وہ گوڑ گانوں کے رہنے والے ہوں گے، میں نے عرض کیا کہ ہمارے علاقے میں مستورات ایک لفظ " سرفتہ " بولتی ہیں۔ جس سے مراد سہولت یا اطمینان کی حالت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ دلی میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسے الفاظ تحریر میں رواج پانے چاہئیں۔ یہ لفظ تو صوتی اعتبار سے بھی اچھا لگتا ہے۔ جالبی صاحب نے بھی اس لفظ کو پسند فرمایا۔ اس سلسلہ میں " معافی چاہنا " اور " معافی مانگنا " بھی زیر بحث آیا فرمایا اچھے پڑھے لوگ " معافی مانگنا " بولتے ہیں مجھے اس سے بڑی کوفت ہوتی ہے

شاہد صاحب نے پاکستان رائٹرس گلڈ کے قیام میں پوری جدوجہد اور کوشش کی اور آخر وقت تک وہ ادیبوں کی اس جماعت سے وابستہ رہ کر اس کی ترقی و بہبود میں کوشاں رہے۔ تین سال تک پاکستان رائٹرس گلڈ (کراچی ریجن) کے سکریٹری رہے۔ ان ہی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں پاکستان رائٹرس گلڈ ہاؤسنگ سوسائٹی وجود میں آئی جس کے تحت رائٹرس کالونی کی جدوجہد شروع ہوئی، ۱۹۶۵ء میں پاکستان رائٹرس گلڈ (کراچی ریجن) کے انتخابات ہوئے میں بھی مجلس عاملہ کے لئے کھڑا ہو گیا۔ مولوی اعجاز الحق قدوسی صاحب ہمارے ممدو معاون اور مشیر و کارکن تھے۔ یوسف بخاری اور نور الصباح بیگم کے ساتھ ہمارا مختصر سا پینل تھا۔ یہ الیکشن بھی ایک مصیبت تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ الیکشن ہمیشہ مصیبت ہی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے پاپڑ بیلے دن کو رات اور رات کو دن کر دیا۔ وقت بے وقت مولوی قدوسی صاحب کی معیت میں ٹھکر جھنکائی ہو رہی ہے، ہم اپنی ناتجربہ کاری سے کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ پھنس گئے جو ہماری گوں کے نہ تھے اور بعض اوقات ان کی خفیف الحرکتی سے ہماری خواری بھی ہوئی۔ اس پورے ہنگامے میں قدوسی صاحب کی معیت میں شاہد صاحب سے ملاقاتیں ضرور رہیں۔ اور انھوں نے حسب موقع مشورے بھی دئے مگر اپنی آنیشل حیثیت کو محفوظ رکھتے ہوئے۔ ایک روز ہم پہنچے قدوسی صاحب نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا بھئی شاہد صاحب! ایوب قادری، آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں بولے فرمائیے کیا کام ہے؟ قدوسی صاحب نے ٹیپ کا بند ادا کیا کہ آپ ان کو اپنا ووٹ تو دیں گے ہی مگر کچھ اور ووٹ بھی دلوائیے۔ شاہد صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا۔ بھئی مولوی! سنو خیر ان کو تو میں ووٹ دے دوں گا باقی اور کسی کے لئے مجھ سے امید نہ رکھئے اور یہ بات تو میرے لئے بالکل ناممکن ہے کہ میں کسی سے ووٹ کے لئے کہوں۔ میں کسی سے کیوں کہوں؟ ہمارا مطلب ان کے ووٹ کی توثیق کرانی تھی انتخاب ہوا، شاہد صاحب نے مجھے ووٹ دیا۔ وہ رائے شماری میں بھی تھے۔ باقاعدہ اعلان سے چند منٹ پہلے شاہد صاحب

آئے اور اشارے سے مجھے کامیابی کی اطلاع دی اور اس کے بعد جناب ابن انشا نے بتایا کہ بھئی تم کامیاب ہو گئے اس تقریب کا ایک گروپ فوٹو لیا گیا جو متعدد رسائل میں چھپ چکا ہے۔ شاہد صاحب اس گروپ فوٹو کی گویا جان ہیں،

شاہد صاحب پرانی تہذیب اور نئی تہذیب کی درمیانی کڑی تھے۔ مگر مشرقیت ان کے مزاج میں رچی بسی تھی، وہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ دم توڑتے ہوئے مسلم معاشرے کی یادگار تھے۔ جہاں ان میں مروت اخلاص، ملنساری بدرجہ اتم تھی وہیں بعض منفی پہلو بھی تھے، "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کے وہ سختی سے قائل تھے خاندان اور بزرگوں کا بھرم قائم رہے۔ ان روایات کو آنچ نہ آئے۔ ہوا یہ کہ جوش ملیح آبادی صاحب نے ان کے دادا جان مرحوم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی کتاب منتخب الحکایات کی زبان و بیان کو زمانہ حال کے مطابق کر دیا یا شاہد صاحب کے الفاظ میں اس کتاب کی غلطیاں نکالیں۔ یہ بات شاہد صاحب کو سخت ناگوار ہوئی، بلکہ ان کے دل میں جوش صاحب کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔ اور جب صہبا لکھنوی نے افکار کا جوش نمبر نکالا تو شاہد صاحب نے بھی مدیر افکار کی درخواست پر ایک دلچسپ مضمون بھر دقلم کر دیا جس میں دیدہ کم اور شنیدہ زیادہ تھا اور زبان کے تو کہنے ہی کیا۔ بقول شخصے چونکھی لڑی تھی اور جوش صاحب کے سلسلے میں کوئی کون کسر باقی نہیں رکھی تھی۔ یہ مضمون افکار کے جوش نمبر میں شامل ہوا۔ پھر کیا تھا جوش صاحب کو بھی یار لوگوں نے بھڑے پر چڑھایا؛ انھوں نے بھی ایک "جواب نامہ" رقم فرمایا جس میں جوش صاحب نے اپنی صفائی پیش کی اور اشارے کنائے میں دو چار باتیں ایسی بھی کہہ گئے کہ جو شاہد صاحب کے خون کھولانے کا سبب بنیں اور انھوں نے اس کے انتقام میں ساقی کا جوش نمبر نکالا۔ اس کے لئے انھوں نے دہلی کا سفر اختیار کیا، پاکستان و ہند کے علمی و ادبی حلقوں سے ربط قائم کر کے ہر وہ اخبار، رسالہ، مضمون، کاغذ اور پرزہ حاصل کیا جس میں جوش صاحب کے خلاف کچھ لکھا گیا تھا اور اس طرح شاہد صاحب نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہمارے نقطۂ نظر سے اس کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ "جوشیات" کے سلسلے کا جو منفی ادب تھا وہ شاہد صاحب کی کوششوں سے سب یکجا ہو گیا اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک اچھی خاصی دستاویز مہیا ہو گئی۔ اس میں ان کے مشرقی رکھ رکھاؤ، خاندانی وقار اور ٹھسے کا سوال تھا۔ جس کا شاہد صاحب نے بھرم رکھا۔ حالانکہ کراچی اور لاہور کے اکثر ادیبوں اور دانشوروں نے پوری پوری کوشش کی کہ ساقی کا جوش نمبر نہ نکلے مگر شاہد صاحب کے عزم و ارادہ، یا انتقامی جذبے کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی چاہے وہ پیر حسام الدین راشدی ہوں یا جمیل جالبی۔ اس نمبر کے سلسلے میں میں نے بھی بعض چیزوں کی نشاندہی کی اور ایک دو چیزیں فراہم کر کے بھی دیں۔ یاد پڑتا ہے کہ دہلی یا کراچی سے شاہد صاحب نے مجھے ایک یا دو خط بھی لکھے۔ افسوس کہ وہ اس وقت ہم دست نہ ہو سکے۔

میں نے شاہد صاحب سے عرض کیا کہ ساقی نمبر میں ایک مضمون رہ گیا جو بہت ضروری تھا۔ فرمانے لگے کیا؟ میں نے کہا کہ منتخب الحکایات کی جو غلطیاں جوش صاحب نے نکالی تھیں وہ نقل کی جاتیں اور پھر ان پر آپ کا محاکمہ نہ مانے ہوتی۔ سن کر خاموش ہو گئے۔

دہلی کی زبان، ادب، ثقافت، معاشرت اور تہذیب و تمدن پر لکھنے والوں میں ملا واحدی، فضل احمد خاں شیدا، خواجہ محمد شفیع، اشرف صبوحی، یوسف بخاری اور شاہد صاحب سرفہرست ہیں۔ ملا واحدی اور شیدا صاحب تو اب بالکل چراغ سحری ہیں۔ خواجہ صاحب امریکہ سدھار رہے۔ اشرف صبوحی صاحب کو ہمدرد دسنے داب رکھا ہے۔ یوسف بخاری صاحب کو اردو بورڈ کی مصروفیات کب فرصت دیتی ہیں۔ شاہد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاہد صاحب نے ساقی اور انجام میں دہلی کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ یکجا کر کے "دلی جو ایک شہر تھا" کے عنوان سے شائع ہونا چاہئے اور ہم اس سلسلے میں دہلی کے نامی گرامی فرزند حکیم محمد سعید دہلوی کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ وہ ہمدرد اکیڈمی سے شاہد دہلوی صاحب کی یہ یادگار روزگار کتاب شائع کر کے اہل ادب کو عموماً اور دلّی والوں کو خصوصاً شکریہ کا موقع دیں۔

شاہد صاحب نے "دلی کی بپتا" میں نہ صرف اپنی بپتا بیان کی ہے بلکہ پوری قوم کی مصیبت کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلّی والوں پر ۱۹۴۷ء (انقلاب) میں کیا گزری۔ فسادات کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں

شاہد صاحب نے اپنی کتاب "گنجینۂ گوہر" میں سترہ ادیبوں اور دانشوروں کے خاکے لکھے ہیں۔ اردو ادب میں گنجینۂ گوہر یادگار کتاب ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلی قابل ذکر کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کی چند ہم عصر ہے اس کے بعد سید احمد صدیقی کی گنجہائے گراں مایہ اور مولانا عبدالمجید سالک کی یاران کہن ہیں۔ چوتھی کتاب گنجینۂ گوہر ہے جو زبان و بیان اور صداقت و خلوص کے اعتبار سے منفرد ہے اس میں عظمتوں کے منارے بھی قائم کئے گئے ہیں اور کھنڈروں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی غربت و افلاس خواجہ حسن نظامی کی کتاب ساری کی فیکٹری، ایم اسلم کی شرافت اور عظیم بیگ چغتائی اور میراجی کی سچی تصویر شاہد صاحب ہی کا قلم کھینچ سکتا تھا۔

ورد کاکوروی پرانے بزرگ ہیں کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے۔ جدید نسل کے نمائندوں کے حالات کی فراہمی میں انھوں نے مجھ سے مدد چاہی۔ میں نے

بہت سے لوگوں کے حالات فراہم کرکے دیدیے ایک روز شاہد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میرا سوال سن کر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد ٹال گئے چند روز کے وقفے کے بعد پھر میں نے ایک روز ذرا اصرار سے کہا تو انگریزی میں ٹائپ شدہ حالات دیدیے۔ گلڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے اکثر ضرورت پڑتی تھی۔ اس غرض سے یہ حالات ٹائپ کروا لیے تھے۔ خیر اس وقت تو ان حالات سے میں نے کام چلالیا۔ مگر میرے دل میں یہ خواہش رہی کہ شاہد صاحب کا باقاعدہ انٹرویو لوں۔ ایک روز حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ اسپتال میں ہیں۔ جب اسپتال سے واپس آئے تو میں پھر حاضر خدمت ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں چلا آیا۔ خیال کیا کہ کسی اور روز ذرا تفصیلی طور سے ملوں گا تو انٹرویو لوں گا کہ ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء بروز اتوار روزنامہ جنگ (کراچی) میں یہ جانکاہ خبر پڑھی کہ رات گیارہ بجے شاہد احمد دہلوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ رہے نام اللہ کا۔

قطعہ تاریخ وفات

مولوی شاہد احمد دہلوی مرحوم و مغفور مدیر ساقی

رئیس امروہوی

وصال شاہد احمد دہلوی ہے — ادب کا نثر کا انشا کا ماتم
مدیر ساقی بزم صحافت — ادیب و نکتہ پرداز مسلّم
عبارت نثر دہلی کا نمونہ — نذیر احمد کی تحریروں کا عالم
وہ سب کچھ کہہ گیا ہے کہہ چکا ہے — رئیس اس کے علاوہ کیا کہیں ہم
جہاں تک سال غم کا ہے تعلق — غم شاہد ہے گویا شاہد غم

۱۳۸۷ ہجری

مشتاق احمد[1]

بیاد شاہد

مرحوم ادیبوں اور شاعروں کے جنازے میں شرکت تو میں ضرور کرتا ہوں۔ لیکن ان کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسہ ہائے تعزیت میں شرکت پر خود کو کبھی آمادہ نہ کرسکا۔ یہ اس لئے کہ بارہا کے مشاہدے سے یہ خیال میرے دل میں یقین کی حد تک جاگزیں ہوچکا ہے کہ ایسے جلسوں کے داعیان و منتظمین عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جنکی ادبی قامت اتنی بلند نہیں ہوتی کہ وہ ادبا و شعرا کے ہجوم میں نمایاں نظر آسکیں اس لئے یہ لوگ اس قسم کے جلسے منعقد کرتے ہیں اور مرحوم کے ہم پلہ ادبا و شعرا کو دعوت تقریر دیکر اور ان کی میت میں خود اپنی زندگی کی پہلی اور آخری تقریر ارشاد فرما کر اپنے آپ کو میدان ادب کا پانچواں سوار ظاہر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ لوگ مرحوم کی لاش پر کھڑے ہوکر اپنی قامت ادبی کو بلند ظاہر کرتے ہیں۔

ایک اور سبب ایسے جلسوں سے کترانے کا یہ بھی ہے کہ ان میں عموماً مرحوم ادیب یا شاعر کی مالی حالت کے سقیم ہونے کا چرچا کیا جاتا ہے۔ اور صاحبان خیر سے عموماً اور حکومت سے خصوصاً اپیل کی جاتی ہے۔ کہ مرحوم کے پسماندگان کی مدد کی جائے۔ میرے نزدیک یہ حرکت نہ صرف مرحوم کی روح کو تکلیف پہنچانے کے مترادف ہے بلکہ مرحوم کے پسماندگان کی عزت نفس پر ایک کاری وار کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کے حالیہ صدمے کے پیش نظر تو قابل خلل انداز محکمۂ انسداد بے رحمی بھی شمار کی جاسکتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ ہر ادیب اور شاعر کی وفات حسرت آیات پر اس کاسۂ گدائی کو گردش میں لے آنا زندہ ادیب اور شاعروں کی بھی سماجی وقعت کم کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے اگر ایک طرف ہمارا سماج بجا طور پر یہ تاثر لیتا ہے کہ جلد ہی ان زندہ ادبا اور شعرا کے انتقال پر بھی ایسا ہی کشکول حرکت میں آنے والا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر یہ کاسۂ گدائی ہر ادیب اور شاعر کا مقسوم ہے تو دوسری طرف اس کا نفسیاتی اثر خود ان زندہ ادیبوں اور شاعروں پر یہ پڑتا ہے کہ وہ اپنی باقیات الصالحات کی طرف سے مطمئن ہوجاتے ہیں اور ان کے لاشعور میں یہی کشکول بس جاتا ہے جس کے طفیل ان کے پسماندگان کی خبرگیری ہوجائے گی۔ اس لئے وہ ان کے واسطے کچھ چھوڑ جانے کی ضرورت سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ضرورت مندوں کی مدد نہ کی جائے۔ بلکہ میں تو اسے سوسائٹی کا ایک فرض سمجھتا ہوں اور اس میں ادیب وغیر ادیب شاعر وغیر شاعر کی تخصیص پر بھی آمادہ نہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ جو کچھ کیا جائے وہ اس طرح ڈھنڈورا پیٹ کر ہی کیا جائے۔ کیوں نہ ہر شخص اپنا اپنا فرض خاموشی سے ادا کردے اور پھر بھی کچھ کسر رہ جائے تو اسی طرح خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے حلقۂ اثر کے لوگوں کو بھی اس فرض کی ادائیگی پر آمادہ کرے۔ یہ کیوں ہو کہ ہر شخص محض تقریریں کر لینے اور مضامین لکھ دینے پر اکتفا کرے اور قربانی کی توقع دوسروں سے رکھے۔ یعنی دامے درمے قدمے سخنے مدد میں اپنا حصہ صرف سخنے یا زیادہ سے زیادہ قدمے تک محدود کرے اور چاہے کہ دامے درمے کا بوجھ دوسرے لوگوں اور حکومت کے کاندھے پر رہ جائے۔

اسی امداد اور مرحومین کی یادگاریں قائم کرنے کے چکر میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مرحوم کے پسماندگان کے مہربان، داعیان الی الخیر کا بھی کافی بھلا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں جو عطر زر و مال ان کے ہاتھوں سے گزرتا ہے۔ وہ لازماً ان کے ہاتھوں بلکہ گھر تک کو معطر کر جاتا ہے۔

---

[1] مشتاق احمد مشہور مزاحیہ شاعر مسٹر دہلوی کا اصل نام ہے۔ شاہد صاحب سے مسٹر صاحب کی پہلی ملاقات اسوقت ہوئی تھی جب انہوں نے شعر گوئی شروع نہیں کی تھی اسلئے انھوں نے اس مضمون کو اپنے اصلی نام سے شائع کرنا پسند کیا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں نے شاہد احمد دہلوی (مرحوم) کی یاد میں منعقد ہونے والے ایک نہیں بلکہ دو دو جلسہ ہائے تعزیت میں شرکت کی۔ اس لئے کہ انتقال کی اطلاع بروقت نہ ملنے کے باعث جنازے کے ساتھ نہ جاسکا تھا اور اس لئے کہ شاہد صاحب کا جو نقشہ میرے ذہن میں ہے۔ اس کا موازنہ ان خاکوں سے کرنا چاہتا تھا جو ان کو قریب کے جاننے والے پیش کر رہے تھے چنانچہ میں نے تقریباً ۵ گھنٹے تک تمام تقاریر نہایت صبر و سکون سے سنیں۔ وہ تقریریں بھی جو مرحوم سن سکتے تو شاید خوش ہوتے اور وہ بھی جن کی بھنک بھی اگر مرحوم کو ان کی زندگی میں مل جاتی تو وہ فی الفور انتقال کر جاتے۔ وہ تقریریں جو تعزیت کے جلسے سے زیادہ کسی تھیٹر کے اسٹیج کے لئے موزوں تھیں اور وہ بھی جو اچھے مقرر کے اسپیچ ہونے کی آئینہ دار تھیں۔ وہ تقریریں جن میں وہ سب کچھ تھا جو ایک اچھی تقریر میں ہونا چاہیے سوائے اس رنج اور افسوس کے جن کا وہ موقع مقتضی تھا۔ اور وہ بھی جو شدت رنج اور دفور الم کے باعث مکمل نہ ہو پائیں۔ وہ تقریریں بھی جن میں مرحوم کی توصیف اس درجہ اور اس طرح کی گئی تھی کہ وہ تحسین ناشناس کے زمرہ میں آ گئیں اور وہ بھی جن میں فنکاروں اور سلیم کارڈنے ممتاز حسن صاحب کے علاوہ مرحوم کی فن موسیقی سے واقفیت ان کی علمی قابلیت اور قلم کاری کی صلاحیتوں کا اس طرح بر سر راہے ذکر کیا تھا کہ اس کو بجا طور پر سکارت سخن شناس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

بہترین تقریر ممتاز حسن صاحب کی تھی جنہوں نے واضح الفاظ میں مرحوم کی زبان دانی کا اعتراف کیا اور اعلان فرمایا کہ اردو کا کون سا لفظ اور کون سا محاورہ دہلی میں کس طرح بولا جاتا تھا۔ اس پر شاہد احمد کا قول حرف آخر تھا۔ مالی اعانت کا سلسلہ میں بھی ممتاز صاحب نے مفید اور ممکن العمل تجاویز پیش کیں اور اپنے عملی تعاون کا یقین دلایا۔

دوسری انتہا پر ایک اور بزرگ کی تقریر تھی جن کو تعریف میں تنقیص بیان کرنے کا ملکہ ہے۔ جسے ہمارے ہاں کہتے ہیں بکری نے دودھ دیا مگر مینگنیوں بھرا۔ چنانچہ انہوں نے مرحوم کو مغرور بنا ڈالا اس طرح ثابت کیا کہ مرحوم کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ مغرور تھے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ بہت ملنسار اور زندہ دل شخص تھے۔ وہ دوستوں میں لڑائی ڈال کر دلوں ہی دلوں میں مذاق ہی مذاق میں) وہ بہت لطف اندوز ہوتے تھے وغیرہ۔

ان بزرگ کو کسی نے ٹوکا نہیں کیونکہ وہ ایسی ہی توصیف بیان کرنے کے عادی ہیں۔ ادیب مرحوم کی تعزیت بھی انہوں نے اس طرح فرمائی تھی۔

"ادیب مرحوم بڑے اچھے شاعر تھے۔ بڑے اچھے ترنم سے پڑھتے تھے۔ بسا اوقات یہ امتیاز مشکل ہو جاتا تھا کہ ترنم اچھا ہے یا شعر . . . . . . ادیب کی شاعری سے قطع نظر وہ بڑے اچھے، شریف اور مخلص انسان تھے . . ."

میں شاہد صاحب کا ہم عمر نہیں۔ میدان قلم میں بھی ان کا ہم رکاب نہیں اور دہلوی ہونے کے باوجود ان سے کافی دور رہا۔ اس لئے ان کی ذات و صفات پر زبان کھولنا یا قلم اٹھانا میرا کام نہیں۔ لیکن ایک موقع پر مرحوم سے براہ راست ایسا واسطہ پڑا جس کا تاثر ذہن پر تا حال تازہ ہے ان واقعات سے مرحوم کی شخصیت کی عظمت کا سراغ ملتا ہے اس لئے بیان کرتا ہوں۔

۱۹۴۳ء میں ساقی کے کسی شمارے میں "باتیں" کے عنوان سے فراق گورکھپوری کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں آتش کا ایک فحش شعر پیش کر کے یہ کہا گیا تھا کہ جو لوگ اسے فحش سمجھتے ہیں۔ ان کی تحلیل نفسی یہ ہے۔ اور وہ لوگ ایسے ہیں ویسے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ شعر جس میں بے خبری میں سرزد ہو جانے والے حرکات کے بے نتیجہ ہونے کا ذکر تھا۔ واقعی فحش ہے۔ آج ترقی پسندی کے ۲۵ سال گزر جانے کے بعد بھی میں اس شعر کو لکھنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ چنانچہ میں نے جواب آں غزل کے طور پر ایک مضمون شاہد صاحب کو بھیج دیا جو کم و بیش

ان الفاظ کے ساتھ واپس آ گیا کہ فحاشی کے سلسلہ میں ان کا پیمانہ میرے پیمانے سے مختلف ہے اور وہ شعر مذکور کو فحش نہیں سمجھتے ہیں ۔ میں نے سل کردہ شعر ایک پوسٹ کارڈ پر بجنسہٖ لکھا اور ان کے گھر کے پتے پر بھیج دیا اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اس شعر کا مطلب اپنی صاحبزادی سمجھا دیں اسکے ساتھ ہی اکبر کا یہ شعر بھی لکھ ڈالا۔

اپنے دامن میں آبرو کی کچھ نہیں پروا انہیں
نذرِ مجنونِ ترقی ہو یہ موتی تو سہی!

لیکن میری یہ حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب میں نے ۱۹۶۸ء میں انہیں شاہد صاحب کو اردو کالج میں منعقدہ ایک مذاکرے میں ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کو یہ جواب دیتے سنا۔

" آپ اپنی صاحبزادی کو "لیڈی چیٹرلیز لور" پڑھنے کے لئے دے سکتے ہیں تو دیں۔ میں تو اپنی بیٹی کو "عصمت" کی چوٹیں بھی نہیں دے سکتا۔ "

یہ وہی شاہد صاحب تھے جو منٹو، عصمت اور کرشن چندر وغیرہ کو دنیائے ادب میں لائے جن کی تصانیف شائع کیں۔ اور جن پر فحاشی کے سلسلے میں بحیثیت پبلشر مقدمات قائم ہوئے تو انہوں نے عدالت ہائے عالیہ تک مقدمات لڑے اور ثابت کیا کہ یہ سب فحاشی نہیں ہے۔ اگر یہی بات انہوں نے اب سے ۲۵ برس قبل کہی ہوتی تو وہ ہر کہہ و مہ سے آفرین سنتے۔ لیکن ۱۹۶۸ء میں جبکہ مذکورہ مصنفین کی تخلیقات اس درجہ عام تھیں کہ پامال اور فرسودہ شمار ہوتی تھیں۔ شاہد صاحب کا یہ اعلان کردار کی وہ عظمت ظاہر کرتا ہے۔ جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر جس بات کو صحیح سمجھتی ہے کہہ گزرتی ہے۔ پھر حقائق کو دیکھ کر اپنے نظریات میں یہ بعد المشرقین والی تبدیلی پیدا کر لینا اور اپنی ناک کا خیال کئے بغیر بھی اس کا اعتراف کر لینا عظمت کی ایک ایسی نشانی ہے جو شعر و ادب تو خیر دوسرے شعبہ ہائے حیات میں بھی کم نظر آتی ہے۔

اسی سال شاہد صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے طنزیہ مزاحیہ جریدے "پھلجھڑی" کی تعریف فرمائی پھر گفتگو شخصیت نگاری کی ہونے لگی۔ میں نے عرض کیا کہ بڑے لوگوں کے عیب بیان کرنے والا نفسیاتی اعتبار سے خود اپنے عیوب پر اپنے دل کو مطمئن کرتا ہے کہ جب اتنی بڑی شخصیتوں میں اتنے عیوب ہیں تو ہم میں بھی اگر کچھ عیوب ہیں تو بے جا نہیں۔

حقیقت یوں بھی تلخ ہوتی ہے۔ اور اس پر وہ جس کی زد میں انسان خود آ رہا ہو۔ وہ تو جیسے دو آتشہ ہو گئی۔ ظاہر ہے شاہد صاحب کو جلال آ گیا۔ ادھر سے بھی جواب ایسا ہی سخت ملا۔ چنانچہ وہ روٹھے اور ہم چھوٹے۔ لیکن رات کو جب میں نے حسب عادت دن کا جائزہ لیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ زیادتی میری ہے چنانچہ میں نے معافی نامہ لکھا۔ جس کا جواب فی الفور آیا کہ غصہ میں سردی گرمی ہو ہی جاتی ہے۔ ممکن ہے میں نے بھی کچھ زیادہ ہی کہہ سن دیا ہو اس لئے معاملہ رفت گذشت۔

شاہد صاحب کی عظمت کی یہ دوسری مثال تھی۔ ورنہ فنکاروں کے دل اتنی آسانی سے کہاں صاف ہوتے ہیں۔

اس کے بعد شاہد صاحب سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں لیکن وہ سب "محفل غیر میں گاہے سر راہے گاہے" قسم کی تھیں۔ میں ان کی نثر نگاری

کا عاشق تھا۔ اور وہ بھی بزرگانہ شفقت سے نوازتے تھے۔ اس لئے میری طرف سے گرم جوش سلام اور ان کی طرف سے دعا کا سلسلہ چلتا رہا۔

ایک آدھ بار ان کے گھر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اور وہاں جا کر احساس ہوا کہ شاہد صاحب اپنی خودداری کو کس طرح یوں نباہ لیتے ہیں کہ ہر شخص تعریف کرنے پر مجبور ہے۔ اور ان کا کچھ عزیز دوستوں اور رشتہ داروں نے تو ان کی مالی حالت کے ستیم ہونے پر اظہار تعجب بھی کیا کیونکہ شاہد صاحب نے دست سوال دراز کرنا تو کیا ان کے سامنے یہ ذکر کبھی چھیڑا ہی نہیں تھا۔

شاہد صاحب اس حقیقت سے واقف تھے کہ کم آمدنی میں گزر بسر مشکل نہیں ہے بشرطیکہ انسان اپنے معیار زندگی کو زبردستی بلند کر کے اس قلیل آمدنی کو چھپانے کی کوشش نہ کرے چنانچہ انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ لوگ ان کے لباس ان کی پرانی عینک عمر رسیدہ ٹوپی اور ان کے گھر کو جدید فرنیچر سے بے نیاز دیکھ کر ان کی قلیل آمدنی سے واقف ہو جائیں گے۔ انہوں نے اپنی بنیادی ضروریات کم سے کم کریں۔ تاکہ کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ اور اس کی قیمت میں حق گوئی کو ترک کرنا پڑ جائے۔ اور اپنی خودداری کو مجروح ہوتا دیکھ کر خاموشی اختیار کرنی نہ پڑ جائے۔

ہے لازم احتیاج انسان اپنی کم سے کم کر لے
کہ یہ ظالم سکھا دیتی ہے شیروں کو بھی مکاری
حیات شاہد احمد دہلوی خود اس پہ شاہد ہے
کہ حاجت کم جہاں ہوتی ہے بڑھ جاتی ہے خودداری

جب ان پر دل کا دورہ پڑا تو میں نے بھی ہسپتال میں حاضری دی لیکن ملاقات منع تھی۔ پھر کچھ عرصہ بعد ریڈیو اسٹیشن میں ملاقات ہوئی۔ تو میں نے اظہار نیازمندی کے بعد عرض کیا کہ موت تو خیر وقت مقررہ پر ہی آئے گی لیکن آپ اگر اس مہلت کو غنیمت جانیں اور جسم و جاں کو آرام دیں تو اس وقت تک کی زندگی آرام سے گزر جائیگی۔ فرمایا "آرام کہاں رکھا ہے اب، دو ماہ بیمار رہا تو اس کی تنخواہ کٹ گئی اب اور آرام کروں تو کھاؤں کیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ مجھ سمیت سینکڑوں قدردان جس فنکار کے ہوں وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہے۔ "ہم اگر آرام فرمائیں تو پھر کھائیں گے کیا۔"

لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم سب مردہ پرست ہیں۔ زندوں کی قدردانی ہمارا شعار نہیں۔ یہ نہیں کہ ہم کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ بات صرف اتنی ہے کہ زندہ افراد کی عظمت تسلیم کرنے میں ہمارا جذبہ انا آڑے آ جاتا ہے۔ اس لئے ہم اس اعتراف کو اس وقت تک اٹھا رکھتے ہیں جب تک کہ ہمارا ممدوح اللہ کو پیارا نہ ہو جائے۔

اپنی ناقدری پہ آزردہ مجھے وہ دیکھ کر
ہنس کے فرمانے لگے مضطر نہ یوں گھبرایئے
قدردانی کی پیاس تو شرط صرف ایک موت ہے
آپ کی بھی قدر ہوگی پہلے مر تو جایئے

نصل شحان

مدتوں روئے گی شاہد کو زبانِ اردو

شاہد بھائی! سنا ہے کہ آپ کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ پاکستان میں آنے کے بعد جن حالات سے آپ گزرے ہیں۔ یہ آپ ہی کا ہارٹ تھا۔ جو بیس برس تک فیل نہیں ہوا۔

شاہد بھائی آپ نے بھی کونسا دھندا اختیار کیا ہے۔ اس دھندے میں جب خلوص اور دیانت سے کام لیا جاتا ہے تو ہارٹ ضرور فیل ہو جاتا ہے۔ اس دور میں ادب کا کاروبار آپ جیسے لوگوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ میں نے تو آپ سے کئی سال پہلے آپ سے یہ کہا تھا کہ ساقی کا دفتر منہدم کر کے یہاں ایک پٹرول پمپ لگوا لیجئے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے

لیکن آپ تو اس زمانے میں خلوص اور دیانت کی باتیں کرتے تھے۔
مجھے آپ کے مرنے کے بعد آپ کی ان باتوں پر ہنسی آتی ہے۔

آپ کے سائے میں ترقی پسند ادب پروان چڑھا۔
آپ کا رسالہ ساقی جو آب تول سے بکتا ہے۔ آج سے تیس سال پہلے یہ اردو کے عہد جدید کا علمبردار تھا۔
آپ اس انقلاب آفریں دور کے نقیب بھی تھے اور خالق بھی اور امام بھی۔
عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، حسن عسکری، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر سے کون واقف تھا۔
اگر ساقی نہ ہوتا اور آپ ان قلم کاروں کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تو ان کی صلاحیتیں کیونکر بروئے کار آتیں۔
یہ تو خود بھی اپنی صلاحیتوں سے واقف نہ تھے۔ اردو ادب کے آسمان پر آپ نے اپنے پیچھے کیسے کیسے تابندہ ستارے چھوڑے ہیں۔

یہ جو آج ہم اردو افسانوں اور ناولوں میں ایک نئی زندگی اور ایک جرأت محسوس کر رہے ہیں تو اسکا سہرا آپکے سر ہے

اور جب آج میں نے آپ کے جنازے کو کاندھا دیا تو مجھے یہ محسوس ہوا جیسے میں اپنی قوم کے پچاس سالہ تہذیبی سرمائے کو کاندھا دے رہا ہوں۔

میں قبرستان نہیں گیا۔ آپ کے مرنے کے بعد آپ پر دو مٹھی خاک ڈالنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے آپ جس دن پاکستان آئے تھے۔ ہم نے یعنی ہماری قوم نے تو اسی دن آپ پر خاک ڈال دی تھی۔ آپ کی موت ۱۹۶۷ء میں نہیں ہوئی اگست ۱۹۴۷ء ہی میں ہو گئی تھی۔

دلی میں ادب اور موسیقی آپ کا مشغلہ تھا۔ لیکن یہاں آ کر اس مشغلے کو روزی کمانے کا ذریعہ بنانا پڑا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ جو افسر کم اور انسان زیادہ تھے۔ جو ادیب بھی تھے اور فقیر و درویش بھی۔ اور ان کے عہد میں ریڈیو پاکستان ادیبوں کا تکیہ تھا۔

وہ آپ کو قدر و منزلت کے ساتھ یہاں لائے اور آپ قلم اور آواز کی کمائی سے بال بچوں کا پیٹ پالنے لگے قلم سے پیٹ نہ بھرتا تو گا کر کماتے اور پیٹ بھرتے۔

اور پھر صدر ایوب نے آپ کی خدمات کے صلے میں آپ کو صدارتی انعام دیا۔

صدر ایوب اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرتے ہیں۔ اور جب آپ کو صدارتی انعام مل چکا تو ہم یہ سمجھے کہ آپ فکرِ معاش سے فارغ ہو گئے۔

حالانکہ اس فکرِ معاش ہی نے آپ کو غمِ روزگار سے آزاد کیا۔ اور یہ آپ کے ہارٹ فیل کا باعث ہوا۔

۳۰ جون کو ریڈیو پاکستان سے آپ کا کنٹریکٹ ختم ہونے والا تھا۔ اور آپ کو اس کی بہت فکر تھی۔ آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ آپ کو ساٹھ سالہ قرار دے کر یہ کنٹریکٹ ختم کر دیا جائے گا۔

شاہد بھائی! آپ نے تیس جون کا بھی انتظار نہ کیا۔

جہاں اتنے دکھ سہے تھے وہاں یہ دکھ اور سہ لیتے۔

ہم جو آپ کی زندگی میں آپ کے راستے میں سے کانٹے بھی نہ ہٹا سکے۔ اب آپ کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں ڈنر دیں گے۔ آپ پر مقالے پڑھیں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ ہم آپ کے کتنے قریب تھے۔ اور ہمارے دل میں آپ کے مرنے کے بعد آپ کا کتنا احترام ہے۔

بے چارے جمیل جالبی جو آپ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور جنہوں نے آپ کی زندگی میں دوستی

کا حق ادا کیا ہے دل پکڑے بیٹھے ہیں۔

آپ کے پرانے ساتھی فضل حق قریشی۔ تابش دہلوی۔ ممتاز۔ صادق الخیری اور آپ کے احباب اور عزیز جیسے ڈاکٹر یاور عباس۔ شمس زبیری۔ اسلم فرخی اور سلیم احمد سوگوار بیٹھے ہیں۔

ارجمند بھی یہاں نہیں ہے۔ جب وہ یہ جانکاہ خبر سنے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ مسعود اور محمود لندن میں ہیں۔ ہائے بے چارے۔

ہاں تو شاہد بھائی! آپ نے پٹرول پمپ نہیں کھولا۔ کاش آپ کسی محکمہ میں سیکشن آفیسر ہی ہو جاتے۔ اگر آپ کے قلم پر سرکاری ملازمت کا ٹھپہ لگ جاتا تو آج یوں حیران و سرگرداں نہ ہوتے۔ اور فکرِ معاش آپ کی موت کا باعث نہ ہوتی۔ شاہد بھائی! — اب لکھنے کو کیا رہ گیا ہے، جو لکھوں۔ یوسف بخاری نے ایک شعر کہا ہے۔

رہ گیا تھا وہی ایک مرثیہ خوانِ دہلی
مدتوں روئے گی شاہد کو زبانِ دہلی۔

یہ یوسف بخاری کا اپنا خیال ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ۔

ع مدتوں روئے گی شاہد کو زبانِ اردو۔

(بشکریہ "حریت")

شاہد!

آہ، بزمِ ادب کی ویرانی
آہ یہ قحطِ زمزمہ خوانی
مرگِ شاہد خود اس کی شاہد ہے
کوئی شاہد کا اب نہیں ثانی

صہبا اختر

سید یوسف بخاری دہلوی

داغ فراق

ایسا کون آئے گا اب زمزمہ خوانِ دہلی
مدتوں روئے گی شاہد کو زبانِ دہلی

باپ دادا ترے بے مثل، بشیر اور نذیر
جن کی تحریر میں زندہ تھی زبان دہلی

بیخود[1] و سائل و نادان ہمہ دان آغا
تھے ترے دور کے یہ نامورانِ دہلی

وہ تو اللہ کو پیارے ہوئے اور ان کے بعد
تیرے ہی دم سے تھی سب شوکت و شانِ دہلی

اردو بازار[2] ہی وہ میکدۂ ساقی[3] تھا
جمع ہوتے تھے جہاں آ کے مغانِ دہلی

ہائے وہ "دلی کی بپتا" کا بیانِ دل سوز
درد میں ڈوبی ہوئی اُف وہ فغانِ دہلی

"دلی اک شہر تھا" "گنجینۂ گوہر" یکسر
انہی شہ پاروں میں پنہاں ہے نشانِ دہلی

جس کے چٹخارے لیا کرتی تھی یاروں کی زبان
مل گیا خاک میں وہ لطفِ بیانِ دہلی

اک قیامت تھا ترا نعرہ کہ جس کو سن کر
وجد کرتے تھے پری چہرہ بتانِ دہلی

تجھ پہ ہو سایہ فگن نعرۂ تکبیر مدام
تو سُنے قبر میں بھی کاش اذانِ دہلی

دیکھیے کن آنکھوں سے یوسف وہ ترا اُجڑا[6] دیار
جو حقیقت میں ہے اب مرثیہ خوانِ دہلی

ہے مِرا آہ سے رحلت کا یہ سن داغِ فراق
۱۳۸۹ھ
منبع رنج و الم تھا جو بیان دہلی

(۱) جناب وحید الدین صاحب بیخود دہلوی۔ جناب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی ۔ جناب مولوی احتشام الدین نادان دہلوی جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی (۲) اردو بازار دہلی (۳) رسالہ ساقی دہلی (۵) شخصی خاکے (۶) انجام، کراچی کے مطبوعہ مضامین

محمد معین الدین دردائی

عبدالرحیم خانخاناں

اور ان کے کتب خانے کے عروج و زوال کی ایک جھلک

عبدالرحیم خانخاناں رحیم جہاں فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور ہندی زبان کے بہت بڑے عالم اور نازک خیال شاعر تھے۔ وہاں علماء، شعراء اور ادیبوں کے دل سے قدردان اور سرپرست بھی تھے۔ وہ صاحب قلم اور صاحب سیف ہونے کے ساتھ ساتھ رحمدلی اور فیاضی کے پیکر تھے۔ شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں ان کا بہت ممتاز مقام تھا۔ وہ اچھے سپہ سالار، اچھے مدبر اور قابل اعتماد انسان تھے شہنشاہ اکبر کے وزیر اعظم کی حیثیت سے جہاں ان کا کارنامہ یادگار ہے وہاں فتوحات ملکی کے اندر بھی ان کا نام معدودے چند جنرلوں کے اندر لیا جاتا ہے۔

شہنشاہ اکبر کو ان پر اس درجہ بھروسہ تھا کہ اس نے اپنے فرزند اور ولی عہد سلطنت شاہزادہ سلیم کی تعلیم اور اتالیقی کی خدمت بھی ان ہی کے سپرد کر دی تھی۔ اپنی لیاقت، صلاحیت، علمیت کے بل پر وہ وزیر اعظم اور سپہ سالار اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے۔ انہوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے۔ سیاست کی گتھیاں سلجھائیں بہت سے ممالک فتح کئے اور ہزاروں سرکش اور باغی سرداروں کے سر کو شہنشاہ کے قدموں پر جھکا دیا۔

سرتاج الشعراء عبدالرحیم خانخاناں عیرفانی شاعر صاحب اسلوب ادیب اور متبحر عالم تھے وہ میدان جنگ میں جہاں فولاد کی دیوار ثابت ہوتے تھے وہاں علماء اور شعراء کی مجلس میں ابریشم سے بھی زیادہ نرم اور سورج کی کرن سے بھی زیادہ فیاض تھے۔ یہ رحیم ہی تھے جنہوں نے ایک ہندی شاعر گنگ کی ایک نظم پر چھتیس لاکھ روپیہ بخش دیا تھا۔ ان سب خوبیوں، فیاضیوں اور علم دوستی کے ساتھ ساتھ ان کو کتابوں اور فن مصوری سے بھی بڑا عشق تھا۔ وہ اچھی نادر کتابوں اور مصوری کے بہترین نمونوں کے دلدادہ تھے وہ خود اچھے مصور تھے اور فن مصوری کے نادر نمونوں کے لئے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں جتنے درباری شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو پہلے عبدالرحیم خانخاناں کے زیر سرپرستی رہ کر ان کے کتب خانہ اور ذاتی علم و فن سے فیضیاب ہو چکے تھے۔

عرفی اور نظیری نے جو اپنے وقت کے بہت نامی شعراء تھے۔ شہنشاہ اکبر، جہانگیر، اور شاہزادہ مراد کی شان میں شاندار قصائد لکھے ہیں لیکن ان سے بھی بڑھ کر اور یادگار قصائد خانخاناں رحیم کی شان میں چھوڑ گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے

کہ شعرا اور علما کے دل میں ان کا کتنا احترام اور بلند مقام تھا۔

خانخاناں رحیم کی بزم بڑے بڑے شعرا، نامی علما اور ادباء سے ہمیشہ جگمگاتی رہتی تھی دور دور سے لوگ ان کے علم کی شہرت اور ان کے کتب خانہ کی عظمت کا حال سن کر آتے تھے۔ اور بہت مرعوب ہو جاتے تھے۔ کچھ ان سے اور ان کے کتب خانہ سے مستفید ہو کر چلے جاتے اور بہت زیادہ اس علم و فضل کے مقناطیس سے چپک جاتے تھے۔

خانخاناں رحیم کے یہاں ہندو مسلمان کی کوئی قید نہ تھی کوئی امتیاز نہ تھا وہ علم کے جوہری تھے۔ علم کا موتی جہاں بھی ملتا اس کو گلے سے لگا لیتے اور ہر صاحب کمال کی طرف محبت اور قدر دانی کا ہاتھ بڑھا دیتے۔ گوسوامی تلسی داس سے ان کے اچھے تعلقات تھے کہا جاتا ہے کہ ایک بار کہ ایک برہمن کو جو اپنی لڑکی کی شادی کے لئے روپیہ کا ضرورت مند تھا تلسی داس جی نے ایک دوہا کا مندرجہ ذیل مصرعہ لکھ کر خانخاناں کے پاس بھیج دیا تھا۔

سُورتیا نرتیا سب چاہت پرسن ہوے

خانخاناں رحیم نے اس مصرعہ کو پڑھ کر اس برہمن کو اس کے حوصلے سے زیادہ روپے دیکر واپس کیا اور اس کے معرفت اس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر اس دوہے کو اس طرح پورا کر کے تلسی داس جی کے پاس بھیج دیا۔

گو دھے تُلسی ہوے تُلسی سوست ہوے

مغل دورِ حکومت میں خانخاناں رحیم کا کتب خانہ بھارت کے تمام کتب خانوں میں سب سے زیادہ اہم قیمتی اور مشہور سمجھا جاتا تھا۔ یہ کتب خانہ صوبہ گجرات کے شہر حیدرآباد میں قائم ہوا تھا جس میں خانخاناں نے بےشمار دولت اور انتھک کوششوں کے بعد قیمتی سے قیمتی کتابوں اور مصوری کے نادر نمونوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ بہت سی اہم علمی کتابیں اس میں ایسی بھی تھیں جو انہوں نے اس زمانے کے بڑے بڑے علما، ادبا اور شعرا سے خود لکھوائی تھیں۔ قرآن مجید کے کئی نادر انمول نسخے اس میں اکٹھا کئے گئے تھے جن میں سے بعض فن خطاطی اور خوش نویسی کے اعلیٰ نمونے پیش کرتے تھے بعض پر اعلیٰ درجہ کی مطلا اور مذہب نقاشی بھی کرائی گئی تھی قرآن مجید کے علاوہ مختلف مذاہب کی مقدس کتابیں اس میں بالالتزام جمع کی گئی تھیں۔ فلسفہ، سائنس، طب، شعر و ادب اور تاریخ کی بہت سی اہم کتابیں اس میں موجود تھیں۔ پرانی کتابوں کے ذخیرے کے علاوہ اس دور کے علماء، ادباء اور شعراء کی تصانیف بھی اکٹھا کی گئی تھیں۔ ان میں بعض ایسی تصانیف بھی تھیں جو خانخاناں رحیم نے خود اپنی زیرِ ہدایت مصنفین سے لکھوائی تھیں اکبر کے زمانے کے اکثر و بیشتر مشہور علمی اور سیاسی شخصیتوں کی سوانح حیات بھی اس میں جمع کی گئی تھیں اور جن بڑی شخصیتوں کے حالات زندگی اس وقت تک نہ لکھے گئے تھے انہیں زرِ کثیر صرف کر کے خانخاناں نے لائق مصنفین سے خود لکھوائے تھے۔ ان کی بزم کے تقریباً جتنے شعرا تھے ان سبھوں کے دواوین اس کتب خانے میں موجود تھے اور اس پر بڑی بڑی رقمیں صرف کی گئی تھیں کتابوں کی سنہری روپہلی، ریشمی مخملی اور چمڑے کی جلدوں نے کتابوں کے ظاہری حسن میں بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ کئی ایک نامی گرامی اور مشہور علما اس کتب خانہ کی دیکھ بھال کیلئے متعین تھے جنکو بڑی بڑی تنخواہیں دیجاتی تھیں۔ اس کتب خانہ میں مستقل ایک شعبہ تھا جہیں نادر کتابوں کی نقل ہوتے

اہتمام اور احتیاط سے کرائی جاتی تھی۔ اور اسکی تصحیح اور نظر ثانی کیلئے بڑے بڑے علماء متعین تھے اس شعبے کی نگرانی خود خانخاناں رحیم کرتے تھے۔

اس کتب خانہ کے تحت کوئی سیمینار اور مشاعرے کا بھی خاص انتظام تھا اور اس کے لئے کمیٹی مقرر تھی اس دور کے کوی، اور شعراء میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو خانخاناں رحیم کی بزم مشاعرہ میں نہ شریک ہوا ہو۔

خانخاناں رحیم نے اپنے کتب خانے کے لئے نادر اور انمول کتابوں کے حصول کے لئے بہت سے ملازمین مقرر کر رکھے تھے جو اچھی اچھی کتابوں کا پتہ لگاتے اور انہیں منہ مانگی قیمت پر کتب خانے کے لئے خرید لیتے تھے۔ اس کام میں بہت زیادہ صرفہ تھا۔ ایک بار مولانا جامیؔ کی یوسف زلیخا کی ایک جلد کو خانخاناں نے ایک ہزار اشرفی میں خریدا تھا۔ اس نسخہ کی خاص اہمیت یہ تھی کہ میر علی نامی مشہور شاعر نے جامیؔ کے اصلی مسودے سے اس کو نقل کیا تھا کچھ دنوں کے بعد خانخاناں نے اس نسخہ کو شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیا تھا۔

خانخاناں رحیم کو مصوری میں کافی درک حاصل تھا اور وہ اپنے وقت کے ایک اچھے مصوّر شمار کئے جاتے تھے۔ علماء اور شعراء کی طرح وہ مصوّروں کی بھی بہت قدر کرتے تھے۔ اور فیاضی کے ساتھ ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ مورخین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ مغلوں کے دور حکومت میں فن مصوری کی جو کچھ ترقی ہوئی اس کا سبب زیادہ تر خانخاناں رحیم کی فیاضیاں تھیں۔ کتابوں کی نقل کرانے میں جگہ جگہ مضمون کے لحاظ سے نقاشی اور مصوّری ان کو بہت پسند تھی اور اس کے وہ بہت زیادہ دلدادہ تھے۔ مغل دور کے مشہور اور قابل عزت مصوّر سد صوبی اور ملا محمد حسین کاشمیری۔ خانخاناں ہی کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ اور کتب خانے کو نادر تصویروں سے آراستہ کئے رہتے تھے۔ علیحدہ علیحدہ نادر تصویروں کے علاوہ منقش اور مصور کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ اس کتب خانے میں موجود تھا۔

ملا عبدالباقی کی مشہور تصنیف مآثر رحیمی[1] سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً پینسٹھ[65] علماء، ادباء، شعراء اور مصور خانخاناں رحیم

---

[1] یہ ملا عبدالباقی نہاوندی کی مشہور تصنیف خانخاناں رحیم کی سوانح حیات سے متعلق ہے۔ یہ کتاب اب بہت کمیاب ہے۔ اس کے صرف دو مکمل اور ایک نامکمل نسخے دنیا میں موجود ہیں۔ ایک مکمل نسخہ تو اس کا کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور دوسرا مکمل نسخہ جو بہت زیادہ اہم اور قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس نسخہ کی بڑی اہمیت ایک یہ ہے کہ اس پر خود مصنف ملا عبدالباقی کے لکھے ہوئے حاشیے بھی موجود ہیں۔ یہ حاشیہ ۱۵۲۳ء میں لکھا گیا تھا۔ اس نسخہ کو مصنف نے اپنے پیارے دوست قاضی عبدالعزیز کے پاس تحفتہ بھیجا تھا۔ قاضی عبدالعزیز اس وقت ہمدان کے وزیر اعظم تھے، اس نسخہ میں مصنف کا ایک خط بھی موجود ہے۔ شہنشاہ شاہجہاں کے زمانے میں یہ نسخہ ہمدان سے دہلی آیا اور شاہی کتب خانہ کی زینت بنا۔ اس پر شاہجہاں اور اورنگ زیب دونوں بادشاہوں کی شاہی مہریں اور دستخط موجود ہیں۔ دہلی سے یہ نسخہ پھر حیدرآباد چلا گیا اور کتب خانہ آصفیہ کی زینت بنا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے مستقل طور پر ملازم تھے جن میں سے ہر ایک کو کتب خانے سے متعلق کچھ نہ کچھ کام ضرور سپرد تھا۔ ان میں سے کچھ کے نام مثنے نمونے از خروارے کے طور پر درج ذیل ہیں۔

(۱) میر تقی ان کو باضابطہ کتب خانہ کی درستگی اور آراستگی لائبریرین شپ سے متعلق تعلیم دی گئی تھی۔ اور اسی کے بعد ان کو اس کتب خانہ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا۔

(۲) شیخ عبد السلام اس کتب خانہ کے منتظم اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر متعین تھے ان کی تعلیم و تربیت خانخاناں رحیم نے خود اپنے زیر نگرانی کرائی تھی۔ اس کتب خانہ میں رہ کر مستقل کتب بینی کرنے سے ان کی علمیت اور ان کا علم و فضل بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اور ان کا شمار علماء کے اعلیٰ طبقہ میں کیا جاتا تھا۔

(۳) شجاع سید رازی۔ یہ شروع میں کتب خانہ کے کاتب تھے لیکن بعد میں ترقی کر کے کتب خانہ کے سکریٹری کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔

(۴) محمد حسین کاشمیری۔ یہ اپنی بے مثل فن خطاطی کے لئے چار دانگ عالم میں مشہور تھے۔ اور اس فن میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ انہیں "زریں قلم" کا خطاب خانخاناں نے بخشا تھا۔

(۵) ملا عبد الرحیم عنبریں قلم۔ یہ بھی فن خطاطی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور اپنے وقت کے سب سے نامی گرامی خوش نویس مانے جاتے تھے۔ کتب خانہ کی بہت زیادہ کتابیں انہیں کی فن خطاطی کی مرہون منت تھیں۔

(۶) ملا محمد امین خراسانی۔ یہ اپنے وقت کے بہت ہی مشہور جلد ساز تھے۔ خانخاناں نے چار سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر اپنے کتب خانہ کی کتابوں کی جلد سازی کے لئے ان کو مقرر کیا تھا۔

(۷) محمد امین۔ یہ ملا محمد حسین کے بھائی تھے اور جلد سازی اور رنگ سازی کے فن میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ بھی عرصہ دراز تک خانخاناں کے کتب خانہ سے وابستہ رہے۔

(۸) مولانا مشفق۔ یہ اپنے وقت کے نامی گرامی مصور اور نقاش سمجھے جاتے تھے۔

(۹) مدھوجی۔ یہ اپنے وقت کے سب سے بڑے مصور اور مشہور آرٹسٹ تھے۔

خانخاناں رحیم کے کتب خانہ کی کتابوں کو مصور اور منقش کرنے میں ان کا ہی ہاتھ تھا۔

(پچھلے صفحے کا حاشیہ)
نے اس نسخہ کو وہیں دیکھا تھا اور ایک جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ حیدر آباد سے انگریزوں نے اس نسخہ کو لے کر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں داخل کر دیا جہاں وہ اب تک محفوظ ہے۔

ان دونوں نسخوں کے علاوہ ایک نامکمل نسخہ پٹنہ خدا بخش خان کی لائبریری میں موجود ہے۔ جس کا اول نصف حصہ غائب ہے۔

(۱۰) میاں فہیم۔ یہ خانخاناں رحیم کے خاص تربیت یافتہ تھے اور کتب خانہ سے وابستہ تھے۔

(۱۱) محمد ندیم۔ یہ رنگ سازی میں بہت مشہور تھے۔

(۱۲) مولانا شکیبی۔ یہ بہت اچھے شاعر تھے اور اسی کتب خانہ سے وابستہ تھے۔ اور رفتہ رفتہ کتب خانہ کے ممتاز عہدے پر مقرر ہوگئے تھے۔ خانخاناں رحیم کو ٹھٹھہ کے معرکہ میں جو فتح ہوئی تھی۔ اس موقع پر ایک بے مثل مثنوی لکھ کر انہوں نے اپنے ولی نعمت کی خدمت میں پیش کی تھی۔ جس پر خانخاناں نے ان کو دو ہزار اشرفیاں انعام دیا تھا۔

(۱۳) خواجہ حسین ثنائی خراسانی۔ انہوں نے اپنا دیوان کتب خانہ کی نذر کیا تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں کی تعریف میں انہوں نے کئی قصیدے بھی لکھے تھے۔ جس کو خوش نویس عبدالرحیم نے بہت سلیقے سے لکھ کر کتب خانہ کی کتابوں میں شامل کیا تھا۔

(۱۴) محتشم کاشی۔ انہوں نے اپنی مثنوی کتب خانہ کو دی تھی جسے معزالدین کاشی نے فن خطاطی کا کمال ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اس نسخہ کی کتابت پر خانخاناں رحیم نے خاص توجہ کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کی تیاری میں خانخاناں رحیم نے ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا تھا۔

(۱۵) تقی ہمدانی۔ یہ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے اور کتب خانہ سے منسلک تھے۔

(۱۶) غنی ہمدانی۔ ان کا شمار اس وقت کے جید علماء میں تھا۔ خانخاناں رحیم کی ان پر خاص نظر عنایت تھی یہ بھی کتب خانہ سے وابستہ تھے

(۱۷) محمد شریف نیشاپوری۔ یہ خراسان کے بہت نامی گرامی عالم اور شاعر تھے۔ خانخاناں کے کتب خانہ کی شہرت سن کر اسے دیکھنے کے لئے انہوں نے خاص کر خراسان سے ہندوستان کا سفر کیا تھا اور اس کتب خانہ کی عظمت اور افادیت سے ایسے مسحور ہوئے کہ عرصہ تک یہیں رہ کر اس سے مستفید ہوتے رہے اور رفتہ رفتہ خانخاناں رحیم کی فیاضی اور علم دوستی سے ایسا متاثر ہوئے کہ یہیں کے ہو رہے اور خانخاناں کے دامنِ دولت سے وابستہ رہ کر اپنے علمی مشغلوں میں مشغول رہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً خانخاناں کی شان میں قصائد بھی لکھ کر پیش کئے تھے جو اس کتب خانہ میں محفوظ تھے۔

(۱۸) ساوجی صرفی۔ یہ ایران کے مشہور شاعر تھے۔ انہوں نے خانخاناں رحیم کی تعریف میں بہت سی نظمیں لکھ کر انکی خدمت میں پیش کی تھیں اور پھر اس کو خود سے لکھ کر کتب خانہ کی نذر کی تھیں۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ سب نظمیں کتب خانہ میں موجود تھیں۔

(۱۹) نظیری نیشاپوری۔ یہ خانخاناں رحیم کی علمیت اور فیاضی کی شہرت سن کر خاص ان سے ملاقات کے لئے ہندوستان آئے تھے اور کچھ روز ٹھہر کر خانخاناں کی فیاضی اور مہمان نوازی کا لطف اٹھانیکے بعد واپس گئے۔ واپس جانے کے وقت انہوں نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ کو نذر کیا تھا۔

(۲۰) نورالدین ظہوری۔ یہ مشہور شاعر تھے اور خانخاناں رحیم ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اپنی نظموں کا ایک مجموعہ انہوں نے بھی اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کتب خانہ کو پیش کیا تھا۔

ہر فرد اور ہر شے کا عروج و زوال قدرت کا اٹل قانون ہے۔ زمانہ بھی یکساں نہیں رہتا۔ سہ

بہ یک گردش چرخ نیلوفری　　نہ نادر بجا ماند نے نادری۔

شہنشاہ اکبر کے مرتے ہی خانخاناں کا ستارہ بھی ڈوب گیا اور وہ مصیبت اور پریشانیوں سے دوچار ہو گئے۔ شاہی خاندان کی خانہ جنگی کی آگ کے شعلوں نے ان کے دامن کو بھی محفوظ نہ چھوڑا۔ جہانگیر کے عتاب نے ان کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ ان پر شکست، بے پروائی، اور غداری کے الزامات لگائے گئے۔ ان کی ساری جائداد اور دولت ضبط ہو گئی اور قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اور پھر جب قید سے چھوٹے تو مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے کتب خانہ پر بھی زوال آنا ضروری تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی اہمیت کم ہوتی گئی اور وہی بے مثل کتب خانہ جو شاہی کتب خانہ پر چشمک زنی کرتا تھا اور ہندوستان اور بیرونی ممالک کے علما کی زیارت گاہ بنا ہوا تھا صرف تاریخ کے صفحات پر باقی رہ گیا۔ گردش زمانہ نے اس کا نام و نشان تک نہیں چھوڑا لیکن تاریخ کے صفحات اس کتب خانہ کی تعریفوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اور اس کتب خانہ کی کتابیں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں منتشر ہو کر اپنی عظمت گزشتہ کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک تحقیقات علمیہ کے سلسلے میں اکثر و بیشتر کتب خانوں کی زیارت کا موقع ملتا رہا۔ اور اس جنون نے شمالی اور جنوبی ہند کے اکثر کتب خانوں کے دروازوں تک پہنچایا۔ اس دوران میں میری نظر سے چند ایسی کتابیں بھی گزریں، جو کبھی خانخاناں رحیم کے شہرہ آفاق کتب خانہ کی زینت رہ چکی تھیں اور امتداد زمانہ نے انہیں منتشر کر کے مختلف کتب خانوں میں پہنچا دیا تھا۔ اپنی یاد داشت کی کاپی میں ہم نے ان میں سے بعض کتابوں کے متعلق کچھ تفصیلات اور معلومات نوٹ کر لئے تھے۔ اس جگہ اگر ان کی نشاندہی کر دی جائے تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

(۱)　یوسف زلیخا۔ مولانا جامی کی اس مشہور تصنیف کو مشہور خوش نویس میر کلی نے ۹۲۳ھ میں لکھا تھا۔ خانخاناں نے اس نسخہ کو ایک ہزار اشرفیوں میں اپنے کتب خانہ کے لئے خریدا تھا۔ پھر اس کو شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیا۔ اور وہ شہنشاہ جہانگیر کے ذاتی کتب خانہ کی زینت بنا رہا۔ اس نسخہ میں شہنشاہ جہانگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مضمون ہے جس سے سب حال معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت یہ نسخہ پٹنہ خدا بخش خان کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

(۲)　ششش رسالے سعدی۔ یہ سعدیؒ کے چھ رسالوں کا مجموعہ ہے۔ اس نسخہ پر شہنشاہ شاہجہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند سطریں اور خانخاناں رحیم اور شہنشاہ عالمگیر کی مہریں موجود ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ پہلے خانخاناں رحیم کے کتب خانہ میں تھا اور پھر شاہجہاں اور عالمگیر کے شاہی کتب خانوں کی زینت رہا۔ اور اب یہ خدا بخش خان کی لائبریری پٹنہ میں ہے۔

(۳)　دیوان کامران۔ مغل شہنشاہ بابر کے دوسرے فرزند اور شہنشاہ ہمایوں کے حقیقی بھائی مرزا کامران کے اشعار کا یہ مجموعہ ہے۔ اس کو مرزا کامران کی زندگی ہی میں ہرات کے مشہور خوش نویس محمد اسحاق نے لکھا تھا۔ یہ نسخہ مغل شہنشاہوں کے شاہی کتب خانہ کی زینت رہنے کے علاوہ کئی امرا اور معزز عہدہ داروں کے ذاتی کتب خانوں میں بھی رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نسخہ کو خانخاناں

رحیم کے کتب خانہ کی زینت بننے کا بھی موقع ملا اس پر جہانگیر اور شاہجہاں کے دستخط ہیں۔ اور خانخاناں رحیم کی بھی مہر ہے علاوہ اس کے کئی معزز عہدیداروں اور امراء کی مہریں بھی اس پر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دیوان ملکہ نور جہاں کو بہت پسند آیا اور اس نے اپنے لئے اس کو حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت سے مغل شہنشاہوں کی ملکیت رہا۔ آجکل یہ انمول نسخہ پٹنہ خدا بخش خاں کی لائبریری کی زینت ہے۔

(۴) قرآن مجید قلمی۔ کلام پاک کا یہ انمول نسخہ جو کبھی خانخاناں رحیم کے کتب خانہ کی زینت تھا۔ آجکل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے۔ اس میں کچھ تفسیریں عربی میں اور حاشیہ پر خانخاناں رحیم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کچھ شرحیں ملتی ہیں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں یہ نسخہ شاہی کتب خانہ میں موجود تھا۔ اس پر سینہ ورق کا بہت ہی نفیس اور حسین نقش بنایا ہوا ہے

(۵) تعبیر رویا۔ یہ ابوریحان کی مشہور تصنیف تعبیر خواب سے متعلق ہے اس میں خواب اور اس کے اسرار اور نتائج سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اسے شہنشاہ اکبر نے خانخاناں رحیم کے والد بیرم خان کو تحفتہً دیا تھا۔ اس پر خانخاناں رحیم کی تحریریں موجود ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں یہ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں میری نظر سے گزرا تھا۔ اب کی خبر نہیں۔

(۶) کلیات سعدی۔ یہ شیخ سعدی کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اور فن خطاطی کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کو رنگ برنگ کی تصویروں اور طلائی نقش سے مزین کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ پر افشاں چھڑکا ہوا ہے مغل دربار کے بعض معزز عہدیداروں کی تصویریں بھی اس میں موجود ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس زمانے کی فن مصوری کی ٹیکنیک پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ عرصہ تک خانخاناں رحیم کے کتب خانہ کی زینت بھی رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں مجھے ریاست رام پور کے شاہی کتب خانہ میں اس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اب کی خبر نہیں۔

(۷) مجلس عشاق۔ یہ تیمور لنگ کے پوتے سلطان حسین کی تصنیف ہے۔ سلطان حسین اپنے وقت کا بہت بڑا عالم گزرا ہے۔ یہ قلمی نسخہ مصور ہے۔ اس نسخہ پر خانخاناں رحیم کی تحریر اور دستخط ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس کو ۹۹۹ھ میں خریدا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں یہ کتاب بھی ریاست رام پور کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزری تھی۔

(۸) رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری۔ اپنے وقت کے مشہور صوفی خواجہ عبداللہ انصاری کی لکھی ہوئی تصوف پر یہ بہت ہی اہم تصنیف ہے۔ اس کے کاتب مشہور خوش نویس سلطان علی مشہدی ہیں اس کی کتابت ۹۲۱ھ کی ہے۔ عرصہ تک اس نسخہ کو اپنے کتب خانہ میں رکھنے کے بعد خانخاناں رحیم نے اس کو شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں نذر کر دیا تھا۔ اور پھر یہ کتاب مغل بادشاہوں کے کتب خانہ کی زینت رہی۔ اس پر شہنشاہ جہانگیر اور شہنشاہ شاہجہاں کے دستخط ثبت ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں یہ کتاب بھی ریاست رامپور کے کتب خانہ میں موجود تھی۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ اور بھی کئی اہم کتابیں ریاست رام پور کے کتب خانہ میں ایسی اس زمانے میں میری نظر سے گزریں تھیں جو خانخاناں رحیم کے کتب خانہ کی زینت رہ چکی تھیں۔ مگر تفصیلی یادداشت محفوظ نہیں۔

اکرام احمد

۱۹۶۷ء کی اردو مطبوعات

تاریخ طبری (حصہ اوّل) (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم) مصنفہ: ابی جعفر محمد بن جریر الطبری مترجمہ سید محمد ابراہیم ندوی۔ ناشر نفیس اکیڈمی کراچی ۱

کتاب	موضوع	مصنف	مرتب / مترجم	ناشر
ترجمان القرآن (حصہ اوّل)	(تفسیر سورۃ فاتحہ)	″ ابوالکلام آزاد	مرتبہ محمد اجمل خاں	ناشر: سندھ ساگر اکادمی لاہور
تذکرۃ الموتیٰ والقبور	(مذہب اسلام)	″ قاضی ثناء اللہ پانی پتی	مترجم اقبال الدین احمد	″ واحد بک ڈپو کراچی ۲
اصول فقہ اسلام	(اسلامی قانون)	″ سر عبدالرحیم	″ مسعود علی	″ کریم سنز کراچی ۵
اسلامی ریاست (نظر ثانی ایڈیشن)	(″)	مولفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی	مرتبہ خورشید احمد	″ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور
مسلمان عورت	(″)	مصنفہ فرید وجدی آفندی	ترجمہ ابوالکلام آزاد	″ ہاشمی پبلشنگ ہاؤس کراچی
تعلیمات چیرمین ماؤزے تنگ	(سیاست)	″ ماؤزے تنگ	″ جاوید شاہین	″ مکتبہ میری لائبریری لاہور
نظری سیاسیات (نظر ثانی ایڈیشن)	(″)	″ شاہ فرید الحق		″ سرسید بک کمپنی، کراچی
حقیقت گلزار صابری	(تذکرہ)	″ مخدوم شاہ محمد حسن صابری		″ ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور
میاں افتخار الدین	(سوانح)	″ شورش کاشمیری		″ مطبوعات چٹان لاہور
حمید نظامی	(″)	″ ″	″	″ ″
آپ	(سوانحی خاکے)	″ محمد طفیل		″ ادارہ فروغ اردو لاہور
ادیبہ	(شخصیت وفن)	″ زبیدہ خاتون عبدالسلام		″ آئینہ ادب ″
احوال ونقد غالب	(″)	مرتبہ محمد حیات سیال		″ نذر سنز ″
بنیادی خردحیاتیات	(سائنس)	مصنفہ احمد علی انور		″ مرکزی ترقی اردو بورڈ
انسان اور مشین	(″)	″ ہیرن بیکر	مترجم محمد حسن فرخی	″ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱
کیمیا	(″)	″ برنارڈ جیف	″ فرید الدین قیصر	″ ″ ″
جیتی جاگتی زمین	(″)	″ پیٹر فارب	″ وقار احمد زبیری	″ ″ ″
دل کی دنیا	(ناولٹ)	″ عصمت چغتائی		″ خیام پبلشرز، لاہور
سیاہ حاشیے نیا ایڈیشن	(انشائیے لطیف)	″ سعادت حسن منٹو		″ البیان، لاہور
فاکہہ	(ناول)	اے آر خاتون، زبیدہ خاتون		″ آئینہ ادب، لاہور
روشنیوں کا شہر	(″)	انتصار حسین		″ ہاشمی پبلشنگ ہاؤس کراچی ۵
عنبرین	(″)	حمیدہ جبیں		″ فروغ ادب کراچی ۱۸

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

میر علی اوسط رشک

(مختصر حالات)

اپنے متعلق میر رشک نے خود کہا ہے ؂

طرز کلام رشک سے کہتے ہیں خاص و عام　　شاگرد خاص ناسخ مغفور ہو تو ہو۔

لیکن امتداد زمانہ سے اس شاگرد خاص ناسخ مغفور" کا نام گوشۂ گمنامی میں جا پڑا اگرچہ رشک کا یہ خیال بھی ہے کہ ؂

کہاں کہاں نہیں پہنچا کلام کا شہرہ　　وہ ہم کو جانتے ہیں جن سے ہم نہیں واقف

لیکن واقعہ یہ ہے کہ رشک کو وہ شہرت بھی نصیب نہیں ہو سکی جو ان کے بعض معاصرین کو حاصل ہوئی حقیقت یہ ہے کہ قبول عام جوہر خدا داد ہے اور کسی خوش نصیب ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

میر رشک کے انتقال کے صرف پندرہ سولہ برس کے بعد دیبی پرشاد بشاش نے اپنا تذکرہ" آثار الشعرائے ہنود" چھپوایا اس میں ان کا نام" میر اوسط علی" لکھا (ص۵۴) حالانکہ یہ صحیح نہ تھا۔ صحیح نام ذیل کے مصرعوں میں نظم ہوا ہے۔ ؏

شد کجا میر علی اوسط رشک (منظفر علی اسیر)

دیدار باب جناں میر علی اوسط رشک (صغیر شاگرد رشک)

رشک کی زندگی ہی میں عبد الغفور خاں نساخ نے تذکرہ سخن شعرا تالیف کیا اس میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"رشک تخلص میر علی اوسط، باشندہ لکھنؤ، مقام کانپور ولد میر سلیمان، شاگرد ناسخ، کربلا کی بھی زیارت کی تھی۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا" (ص۱۸۲)

رشک کے والد کا نام بیشتر تذکروں میں غلط ہے۔ کچھ نے نساخ کی طرح میر سلیمان (تذکرہ نادر ص۷۴، خمخانہ جاوید ج ۳ ص۱۳ وغیرہ) بعض نے میر سلمان (جواہر سخن ج۲ ص۲۶۵) اور کچھ نے میر سلیمانی (تذکرہ مخطوطات ج۲ ص۳۶۶) لکھا ہے حالانکہ رشک نے ان کا نام" سلمان" لکھا ہے اور اس کی صحت پر شک کی کوئی وجہ نہیں۔ ؏

والد ماجد من سید سلمان فقیہہ

اپنے والد کے متعلق رشک نے یہ بھی لکھا ہے کہ ـ

آں سید واسطی وعلی ونقیب۔

یعنی ان کا تعلق شہر "واسط" سے تھا اور لفظ "علی" سے ان کے قبیلہ کی طرف اشارہ مقصود ہے، دراصل کسی شخص کو عام حالات میں کسی شہر سے نسبت دیتے ہیں جو اس کا مولد ہو یا جو اس کے بزرگوں کا مسکن ہو کسی شخص کو محض چند روز کے قیام کے سبب کسی خاص جگہ سے نسبت دینا کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ رشک نے اپنے والد کو واسطے سے نسبت دی اور خود اپنا وطن فیض آباد کو قرار دیا ہے

فیض تاریخ رشک میں کیونکر نہ ہو　　کالبد ہے خاک فیض آباد کا

ہزاروں ہموطن اے رشک آتے ہیں زیارت کو　　برسویں دن حسین آباد فیض آباد ہوتا ہے

سعادت خاں ناصر نے بھی اس سلسلے میں لکھا ہے کہ ـــ

" ان کی زبانی بیان کہ مسکن اور مولد فیض آباد" (خوش معرکہ زیبا۔ قلمی)

ان واضح بیانات کے باوجود ناسخ کا انہیں "باشندۂ لکھنؤ" لکھنا غلط فہمی ہی کے سبب ہو سکتا ہے اور اس ایک غلط بیانی نے رشک کو عام طور پر "لکھنوی" مشہور کر دیا چنانچہ ان کے مشہور شاگرد منیر شکوہ آبادی نے بھی لکھا ہے:

" استاذ المحققین سیدی، سندی، مولائی واستادی جناب سید علی اوسط رشک ـ لکھنوی تخم الحایر[1] کی طاب ثراہ" (کلیات منیر)

لکھنؤ سے یہ نسبت ناسخ کے بعد دی گئی ہے۔ یہ سلسلہ اتنا عام ہوا کہ آج بھی رشک اسی طرح مشہور ہیں۔ چنانچہ رشید حسن خاں صاحب نے بھی اپنے مقالہ "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ انتقادی جائزہ" میں انکا نام اسی طرح لکھا ہے:

" میر علی اوسط رشک لکھنوی" (صحیفہ لاہور۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

ناسخ کے اس جملے سے کہ "کربلا کی بھی زیارت کی تھی" ایسا مترشح ہوتا ہے گویا وہ زیارت کے لئے کبھی گئے تھے۔ اور پھر واپس آ گئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رشک نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی اسی طرح ناسخ کے اس قول سے کہ:

" دیوان ان کا نظر سے گزرا"

یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ان کا ایک ہی دیوان تھا کچھ غلط نہیں کہا جا سکتا چنانچہ صغیر احمد جان نے بھی لکھا ہے:

" ایک ضخیم دیوان آپ کی یادگار ہے" (تنویرات ص ۸۵)

بعد کے اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کے "صرف دو دیوان" بتائے ہیں (شعرائے متغزلین ص ۹۷ گل خنداں ص ۲۳ وغیرہ) حالانکہ صحیح تعداد تین ہے۔ ایک حد تک رشک کے سلسلہ حالات میں اس نوعیت کی غلطیاں اس حقیقت پر بخوبی دلالت کرتی ہیں کہ زمانے نے جلد ہی ان کو فراموش کر دیا تھا۔

حکیم سید جعفر حسین کاشف کے سلسلہ حالات میں حکیم محمد فیروز الدین نے لکھا ہے کہ "جناب میر علی اوسط رشک مرحوم

---

(۱) رشک نے ترک وطن کرنے کے بعد عراق میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوگا اس لئے انہیں "حاری" کہنا مناسب ہے

آپ کے ایک خاندانی بزرگ تھے "(رموز الاطبا ج ۱ ص ۳۰۳) اور ان کے خاندانی حالات اس طرح بیان کیے ہیں:
"آپ کے بعض بزرگ بعد انقراض عہد سلطنت محمد شاہ مرحوم دہلی سے فیض آباد عہد شجاع الدولہ بہادر مرحوم جناب نواب بہو بیگم صاحبہ مرحومہ کے علاج کے لئے حسب الطلب تشریف لائے یہاں بھی معزز و ممتاز رہے...
جاگیر پائی منصب پائے حکیم مولوی میر حمید صاحب اور حکیم مولوی میر مہدی صاحب فیض آبادی مشہور تھے۔"
(رموز الاطبا ج ۱ ص ۳۰۳) رشک نے اپنے ایک خالہ زاد بھائی میر اسد سے متعلق کئی قطعات تاریخ کہے ہیں اور میر اسد کا حال محسن نے اس طرح لکھا ہے:
"میر اسد صبر خلف میر مہدی عزیزوں میں خاص محل نواب معتمد الدولہ کے باشندہ لکھنؤ صاحب دیوان شاگرد ناسخ" (سراپا سخن ص ۱۲۸)
اور یہ میر مہدی بھی فیض آبادی ہی تھے، خود رشک کے بیٹے علی ضامن شوق نے اپنے دوسرے خاندانی بزرگوں کی طرح طبابت ہی کو ذریعہ معاش بنایا تھا ـــــ حکیم کاشف کے خاندان کے لکھنؤ منتقل ہونے کے سلسلے میں حکیم فیروز الدین لکھتے ہیں:
"آپ کے بعض بزرگ نواب سعادت علی خان بہادر کے عہد حکومت میں لکھنؤ تشریف لائے (رموز الاطبا ج ۱ ص ۳۰۳)
البتہ خود رشک کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ پہنچے جس کا حال آگے آئے گا۔ حکیم کاشف اور میر اسد کے خاندانوں سے رشک کی قرابت اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ رشک کے اسلاف واسطے ہندوستان میں آکر پہلے دہلی میں مقیم ہوئے اور پھر وہاں سے فیض آباد آئے راستے میں فرخ آباد (قنوج) وغیرہ میں ان کا قیام بھی خلاف قیاس نہیں۔ اپنے سلسلۂ نسب کے متعلق رشک نے اتنی بات کہی ہے ؎

رشک پھولا جو سماتا نہیں پیراہن میں ‏ ‏ بار رے اس کا شجرہ آل عبا تک پہنچے

رشک کے سال ولادت کا تعین آسان نہیں البتہ اکثر تذکرہ نویسوں نے محض اس بنا پر کہ بوقت وفات ان کی عمر ستر سال کی بتائی گئی ہے سنہ ۱۲۱۶ھ کو ان کا سال ولادت لکھا ہے (شعرائے متغزلین ص ۵۹۷ جمخانۂ جاوید ج ۱ ص ۵۵۱ گل رعنا ص ۲۲۱ وغیرہ) لیکن یہ محض تخمینہ ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل واقعات قابل لحاظ ہیں:
۱۔ دیوان رشک میں ۱۲۱۹ھ، ۱۲۲۰ھ اور ۱۲۲۱ھ کے بالترتیب دو، ایک اور ایک قطعات تاریخ درج ہیں۔
ان قطعات میں واقعات اس طرح بیان ہوئے ہیں گویا شاعر کے سامنے کی باتیں ہوں اور ان سے وہ براہ راست متاثر ہوتے رہا ہو بہ ظاہر یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ قطعات واقعات کے گزر چکنے کے کئی سال بعد لکھے گئے۔ البتہ یہ بات کہ ۱۲۲۱ھ کے بعد اور ۱۲۳۱ھ سے پہلے کا کوئی قطعہ تاریخ نہیں ملتا۔ شک پیدا کرتا ہے لیکن سعادت خاں ناصر کے یہ الفاظ بھی ہمارے سامنے ہیں کہ۔

بدوِ سن سے طبع شعر گوئی پر رواں ...

۲۔ رشک نے اپنے سلسلہ حالات میں بیان کیا ہے کہ ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کی "تربیت" ان کے بہنوئی نے کی :

بعد مرگ والدمن تربیت کرد او مرا۔

اس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۱۹ھ (سال وفات پدر رشک) میں رشک کی عمر کم تھی اور ابھی وہ "تربیت" کے محتاج تھے۔

۳۔ رشک نے اپنی پہلی بیوی کے مرنے کی تاریخ اس طرح کہی ہے ؎

رشک تاریخ نکاح و وصل و عمر و مرگ گفت — عقد سال ہژدہم شد سال چہلم موت آہ

یعنی رشک کی شادی ۱۲۲۹ھ میں ہوئی اور ان کی بیوی کا سال ولادت ۱۲۱۱ھ تھا۔ اپنے والد کی موت کے وقت تک رشک کی شادی نہیں ہوسکی تھی، رواج عام یہ ہے کہ شوہر کی عمر بیوی کی عمر سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ خصوصاً پہلی شادی کے وقت، لیکن اس کے برخلاف واقعات بھی ملتے ہیں۔ البتہ اول الذکر دونوں امور پر نگاہ کریں تو بظاہر رشک کا معاملہ رواج عام کے خلاف نہیں معلوم ہوتا۔

ان حالات میں یہ قیاس کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ رشک کی ولادت ۱۲۱۱ھ سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے۔ ممکن ہے ۱۲۰۶ھ کے قریب ہو۔

رشک کے والد ان کو کم عمری ہی میں چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ رشک کے بھائیوں میں بھی شاید اس وقت تک کوئی اس قابل نہ تھا اس لئے ان کی پرورش ان کی چچی کے یہاں ہوئی ۱۲۳۳ھ میں رشک کی اس چچی کا بھی انتقال ہوا۔ رشک نے کہا

آں عم من پرورش کرد مرا — زیں دار فنا گزشت انا للّٰہ

ابن صوری و معنویست تاریخ وفات — شنبہ ششم جمادی الاول حدآہ

۱۲۳۳ھ

رشک نے اس موقع پر اپنے چچا کا ذکر نہیں کیا شاید ان کا انتقال ہو چکا تھا یا بہ سبب پیرانہ سالی خاندان کی کفالت کا کام ان کے سپرد نہ تھا بلکہ ان کا ایک بیٹا میر امانت علی اس بار کو اٹھائے ہوئے تھا۔ چنانچہ رشک کی تربیت بھی میر امانت علی ہی نے کی، ذیل کے قطعہ تاریخ میں رشک نے اس کا اعتراف کیا ہے ؎

اے فلک آں عم زادم بودہ زوج خواہرم — چوں نہ گویم بہر مرگش از تعب افسوس وای۔

میر امانت علی بود نام نامی او با علی — شیعی و پر جرات و عالی نسب افسوس وای

مولدش تنوج و مدفن خاک فیض آباد شد — وا و وا دارم نالہ با شور و شغب افسوس وای

بعد مرگ والدمن تربیت کرد او مرا — چوں نیارم در غمم او تا بہ لب افسوس وای

یافتم تاریخ مرگ ای رشک از ہاتف غیب — آں چہارم از شہر رجب افسوس وای۔

(۱۲۵۴ھ)

اس قطعہ تاریخ میں رشک نے میر امانت علی کے عقیدہ کا اعلان بہت تخریبہ انداز سے کیا ہے۔ یہ بات کچھ میر امانت علی ہی کے ساتھ رشک نے اکثر و بیشتر قطعات میں متعلق حضرات کے مسلک کا ذکر اس قدر وضاحت سے کیا ہے البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۲۳۱ھ تک کے قطعات میں یہ بات نہیں پائی جاتی ـــ میر امانت علی کا مولد قنوج تھا ممکن ہے رشک کے بزرگوں نے دہلی سے فیض آباد آتے ہوئے قنوج میں بھی کچھ مدت تک سکونت اختیار کی ہو۔

میر امانت علی علاوہ چچازاد بھائی ہونے کے ساتھ رشک کے بہنوئی بھی تھے قیاس غالب ہے کہ ان کے ساتھ رشک کی بڑی بہن منسوب رہی ہوں جن کے متعلق رشک کے دیوان میں ذیل کا قطعہ تاریخ ملتا ہے ؎

عمر نفضل النسا بیگم چہ گویم　　　　بحر فاحشن کلانم ای خدا حیف
مہ دیجہ دلبست و ششم بوز　　　　کہ رحلت کرد از دار فنا حیف
چنیں تاریخ صوری معنوی شد　　　　شب آدینہ و ذی الحجہ وا حیف

میر امانت علی کی تربیت کا اثر ہو یا مذہبی تعلیمات کا فیض، رشک ان راسخ العقیدہ لوگوں میں سے تھے جو اپنے عقیدے اور مسلک کا ذکر تخریبہ کرتے ہیں چنانچہ ان کا ایک مقطع یہ ہے ؎

کھلا مدیح و توصیف بار ہا سے یہی　　　　کہ رشک شیعیٔ اثنا عشری ہے بے شبہ

رشک کے اس مسلک نے ان کے کلام کو بہت متاثر کیا ہے انہوں نے اردو شاعری میں حسن و عشق اور شراب و کباب سے متعلق اکثر الفاظ کو اصطلاحی صورت دے کر نیا مفہوم عطا کیا ہے اور اس طرح اردو غزل کی معنویت میں قابل قدر اضافہ کیا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رشک سے پہلے یہ انداز اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ رشک نے اس سلسلے میں شعوری کوشش کی اور بہت غزلیں اسی انداز پر لکھیں۔ ذیل کے اشعار سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ روایتی الفاظ کو اصطلاح کا درجہ دینے کی شعوری کوشش کر رہے تھے ؎

محب ساقی کوثر کے حق میں ہے اے رشک　　　　گزک فواکہ جنت مے طہور شراب
درود آل محمدؐ ہیں نشہ کی باتیں۔　　　　یہاں صلوۃ ہے صہبا یہاں سلام شراب
وہ مست ہوں کہ مرا میکدہ ہے بیت اللہ　　　　طواف کعبہ درود اور حج کا نام شراب
میرے معشوق وہ ہیں جنکو بنائے نور و نوش　　　　حلے لایا کئے فردوس کا میوہ لوٹا۔
میرا معشوق وہ محبوب خدا ہے اے رشک　　　　جسکے بھائی کے تھے سلمان و ابوذر عاشق

اس طرح رشک کے اشعار میں یہ خوبی بھی پیدا ہو گئی کہ اکثر میں "پہلو دار" معنی نکلتے ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

مجھ کو بھاتے ہیں وہ الفاظ جو ہوں پہلو دار　　　　تازہ مضمون ہے وہ نکلے اگر بات میں بات

علم بیان کی رو سے کسی لفظ کو مجازی معنی میں اس خوبی سے استعمال کرنا کہ اصلی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا تعلق ہو

استعارہ کہلاتا ہے رشک نے اکثر پہلو دار معنی کی تلاش میں استعارہ کا استعمال کیا ہے، استعارہ اردو غزل کے لئے کوئی نئی بات ہرگز نہیں لیکن جس کثرت سے اسے رشک نے صرف کیا شاید ان سے پہلے کسی شاعر نے اسے اتنا نہیں برتا۔ اسکے علاوہ انہوں نے اس سلسلے میں "محض خیال آرائی" کے مقابلے میں اصلیت کا بھی لحاظ کیا چنانچہ کہتے ہیں۔ ع

بے اصل استعارے سے کیا ہو کشود کار۔

یوں استعارہ بندی میں انہوں نے امتیازی درجہ ضرور حاصل کرلیا لیکن وہ "المعنی فی البطن الشاعر" کے بھی قابل نہیں تھے بلکہ ایسے شعر کو وہ اصولی حیثیت سے شعر بھی تسلیم نہیں کرتے تھے ؎

وہ شعر کیا کہ معانی ہوں بطن شاعر میں — غلط یہ ہے رہے مغز استخوان سے باہر

(اس مختصر مضمون کا مقصد میر رشک کے حالات بیان کر دینا ہے اس لئے اس بحث کو یہیں چھوڑ کر پھر اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔)

میر علی اوسط رشک نے اس دور میں مروج مختلف علوم و فنون کا تجربی مطالعہ کیا تھا جس کا ثبوت معاصرین کے اقوال سے ملتا ہے۔ میر شکوہ آبادی جو ان کے بہت عقیدت مند شاگرد تھے کہتے ہیں ؎

ان سید فاضل و محقق ہمہ داں — در زہد و ورع وحید مردان خدا

اسی طرح صغیر شاگرد رشک کا یہ شعر قابل ذکر ہے ؎

عابد و زاہد و استاد و بزرگ و ابرار — عاشق حضرت شبیر علی اوسط رشک

ان اشعار سے رشک کی علمیت ہی نہیں، مذہبیت وغیرہ کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ فیض آباد کے شعری اور علمی ماحول نے انہیں بھی شعر گوئی پر مائل کیا، سعادت خاں ناصر نے انہیں کی زبانی بیان کیا ہے کہ

"بدوسن سے شعر گوئی کا سواد، طبیعت سخن کی کاسب، صحبت مشاعرہ پر راغب، فکر موزوں طبیعت رواں" (خوش معرکہ زیبا) اور خواجہ عبدالرؤف عشرت نے لکھا ہے کہ

"عہد نصیرالدین حیدر بادشاہ میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا" (آب بقا ص۶۹)

لیکن عشرت کے قول کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں، ابتداء میں رشک نے میر مستحسن خلیق سے(۱) اصلاح لی اور میر خلیق کے

(۱) میر خلیق اور میر انیس کے متعلق بہ وجہ انکی شہرت کے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں صاحبان صرف مرثیہ گو تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں صاحبوں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی اور اس سلسلے میں بھی بالاستعداد تھے میر خلیق کی غزلوں ہی کے متعلق شیخ مصحفی نے کہا تھا کہ

"اگر زمانہ فرصت خواہد داد خوب خواہد گفت" (تذکرہ ہندی ص۹۱)

اور فیض آباد کے زمانہ قیام میں خلیق غزل گو شاعر ہی کی حیثیت سے متعارف تھے۔ مرثیہ گوئی کے متعلق خیال ہے کہ لکھنؤ میں نواب معتمد الدولہ کی سرکار سے فیض یاب ہونے کے بعد وہ اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے۔ فیض آباد میں عام طور پر انکا مرثیہ کہنا اس عہد کے تذکروں سے معلوم نہیں ہوتا اور غالباً یہی سبب ہے کہ رشک نے بھی مرثیہ کی طرف توجہ نہیں کی

متعلق انہوں نے جو رائے ظاہر کی ہے یہ ہے ؎

میر مستحسن خلیق افسوس — بس عطوف و شفیق بود استاد
خوش بیان شاعری زبان دانی — خاص در این طریق بود استاد
رشک نالید و گفت تاریخش — ہائے ای ہی خلیق بود استاد
۱۲۶۰ھ

میر خلیق کی اصطلاح، اور تربیت سے رشک کو "زبان دانی" کا فائدہ ہوا اور یہ وہ خوبی ہے جس پر وہ تمام عمر فخر کرتے رہے ؎

وہ رسوا ہوں کہ سب طرز سخن پہچان جاتے ہیں — بھڑک جاتے ہیں زاہد برہمن پہچان جاتے ہیں
فصاحت ہیں وہ خوبی ہے کہ چھپتی ہی نہیں ہرگز — مرا انداز ارباب سخن پہچان جاتے ہیں

فیض آباد کے مخصوص علمی اور شعری ماحول کو بھی رشک کے اس "انداز" کی تعمیر میں بہت دخل ہے بقول ناصر خود رشک نے بیان کیا ہے :-

"[1]مرزا محمد تقی خاں ترقی کے دولت خانے میں صحبت مشاعرہ مقرر اور روز مقررہ وہاں اژدہام (کذا) اہل فضل و ہنر چار و ناچار میر مستحسن خلیق کو کہ فیض آباد میں ان سے کوئی بہتر نہ تھا غزل دکھلائی اور ہنرمندوں کی زبان سے واہ واہ پائی چندے زمانہ اسی طرح سے گزرا" (خوش معرکہ زیبا۔ نسخہ پٹنہ)

فیض آباد کا شعری ماحول کئی لحاظ سے دہلی کے ماحول سے زیادہ قریب تھا چنانچہ رشک کے کلام میں بھی اس کے اثرات ملتے ہیں اور کہیں کہیں اپنا رنگ دکھا جاتے ہیں۔

فیض آباد میں بہو بیگم صاحبہ کی سرکار سے تمام اہل شہر مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ میر رشک بھی ان کے وابستگان دولت میں تھے اور بہت آرام سے بسر کرتے تھے لیکن

"[2]سنہ ۱۲۳۱ھ میں کہ جناب عالیہ نے انتقال کیا۔ سر رشتۂ روزگار برہم اور عزم سکونت لکھنؤ مصمم ہوا" (خوش معرکہ زیبا۔ نسخہ لکھنؤ۔)

رشک کے خاندان کے دوسرے افراد بھی اسی سرکار کے دعاگو تھے چنانچہ ایک کا حال محسن شاگرد رشک نے اس طرح لکھا ہے :-

"میر کاظم حسین تنویر ولد[3] میر حسین داروغہ سرکار بہو بیگم صاحبہ زوجہ نواب آصف الدولہ بن میر اکبر علی مغفور کی مرثیہ گو۔

---

(۱) نسخہ لکھنؤ کی عبارت یہ ہے۔ "اس نقل کا انکی زبان سے بیان کہ اس آوان میں مرزا محمد تقی خاں ترقی کے دولتخانے میں صحبت مشاعرہ مقرر اور وہاں اژدہام اہل فضل ہوتا تھا چونکہ میر مستحسن خلیق فیض آباد میں استاد تھے انکو غزل دکھائی اور سامعین سے داد پائی چندے زمانہ اسی طرح پر گزرا"

(۲) نسخہ پٹنہ کی عبارت ہے "سنہ ۱۲۳۱ھ میں ... جناب عالیہ نے انتقال کیا اور سر رشتہ روزگار کا برہم ہوا عزم ... لکھنؤ کا ٹھہرا"

(۳) یہاں عبارت میں غلطی ہے "ولد" کی جگہ "برادر" ہونا چاہیے کیونکہ میر حسین کے متعلق رشک کا بیان ہے کہ "خویش من بود و ہم برادر زادم"

باشندہ فیض آباد مقیم لکھنؤ شاگرد رشک" (سراپا سخن صفحہ ۶۰)

میر کاظم حسین تنویر میر رشک کے بھتیجے تھے چنانچہ وہ خود رشک کو اپنا "استاد و عم شفیق" بتاتے ہیں (نظم گرامی) بہر حال بہو بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد میر رشک کے خاندان کے کم و بیش سبھی لوگ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔

لکھنؤ جانے وقت میر رشک نے میر خلیق سے جو گفتگو کی ناصر نے نقل کی ہے :

"اس وقت بہ سبب اپنی اجنبیت کے دریافت حال شعرائے لکھنؤ میر صاحب مرحوم سے معلوم کیا اور سفارش چاہی میر صاحب نے بعد تأمل کے فرمایا کہ میرے دوستوں میں شیخ امام بخش ناسخ ہیں کہ طبیعت ان کی بہت متین اور فی زمانہ ایسا اور کوئی شاعر نہیں ہے ان کی خدمت میں حاضر رہنا میں نے خط سفارش کا طلب کیا فرمایا کہ اس کی کیا حاجت ہے۔ فقط میرا سلام شوق[1] کہنا" (خوش معرکہ زیبا۔ نسخہ لکھنؤ)۔ اس سے چند قابل ذکر امور پر روشنی پڑتی ہے :

۱۔ صاحب آب حیات نے میر خلیق کے متعلق ناسخ کے چند بیانات نقل کئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ناسخ انکا احترام کرتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ خلیق بھی ناسخ کے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے اور دونوں کے درمیان دوستانہ روابط تھے۔

۲۔ میر خلیق نے ایک باکمال استاد کی طرح میر رشک کی طبیعت کو بخوبی پرکھ لیا تھا اور ان کے مزاج کے مطابق ہی انکے لئے ایک استاد تجویز کیا۔ ناسخ اور رشک کی طبیعتوں میں جو موافقت تھی اس کا اندازہ رشک کے کلام سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ میر خلیق کو میر رشک کی صلاحیتوں پر دلی اعتماد تھا انہوں نے سفارش کا خط لکھنا بھی غیر ضروری سمجھا اور تعارف کے لئے رشک کے کلام کو بہت کافی جانا۔ اس واقعہ سے اس زمانے تک کی رشک کی استعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد ناسخ کے شاگرد ہونے تک جو واقعات پیش آئے وہ بھی رشک ہی کی زبانی ناصر نے نقل کئے ہیں۔[2]

"القصہ فیض آباد سے لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا اور میر امجد علی[3] ہوشیار کی معرفت شیخ صاحب کی خدمت میں پہنچا بطریق نذر بعد سلام و پیام ایک غزل پیش کش کی سر دست مزین اصلاح سے ہوئی اسے سونپ کر رخصت ہوا دو چار روز کے بعد جو پھر گیا کہا کہ وہ مسودہ جاتا رہا آزردگی کو راہ نہ دو اگر تمہاری کہی تھی پھر کہہ سکتے ہو میں نے اسے امتحان سمجھا اور پھر شعر اسی

(۱) نسخہ پٹنہ میں ہے : دریافت حال شعرائے لکھنؤ میر صاحب مرحوم سے کیا اور سفارش چاہی... فرمایا کہ میرے دوستوں میں... ناسخ ہیں کہ طبیعت انکی بہت متین اور فی زمانہ ایسا شاعر نہیں ان کی خدمت میں رہنا میں نے خط سفارش کا طلب کیا۔ کہا اسکی احتیاج نہیں میرا سلام کہنا اور اپنا کلام پڑھنا"

(۲) نسخہ پٹنہ میں ہے" القصہ... لکھنؤ... آیا اور میر امجد علی ہشیار کی معرفت شیخ صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا بطریق نذر ایک غزل پیشکش کی۔ فرمایا کہ اسے چھوڑ جاؤ کہ اصلاح کی جائیگی جب دو چار روز کے بعد... حاضر ہوا فرمایا کہ وہ مسودہ گم ہو گیا اگر تمہیں نے کہی تھی۔ اور کہہ سکتے ہو... میں نے اسی زمین میں کہی... اسے زیور اصلاح سے آراستہ فرمایا وہ ماہ ربیع الاول ۱۲۳۱ ہجری تھا کہ ابتدائے زمانہ شاگردی ہوا۔ اب جو فکر کی... دو تخلص مل کے تاریخ شاگردی کی حاصل ہوئی۔ یہ عجیب قضیہ اتفاقیہ ہے۔"

(۳) ہوشیار کا حال مصحفی نے اس طرح لکھا ہے :

سید امجد علی ہوشیار تخلص ولد سید غلام حسین از اولاد سادات بارہ است وطن بزرگانش شاہجہان آباد خود در باش از چندی در لکھنؤ دارد شاگرد الیہ تا ما میاں تجلی است عمرش تخمیناً پنج و پنج خواہد بود ... دست بی نظمی ... خواندگی چیزی کہ موزوں می کند از زبانش درست می برآید این فیض خاندان میر محمد تقی مرحوم است ... بگفتن ... ہر چہ می گوید از نظر ناسخ می گذراند۔ (ریاض الفصحا صفحہ ۲۷۶)

زمین میں کہہ کر بے گیا شیخ صاحب نے اسے زیور اصلاح سے آراستہ فرمایا وہ زمانۂ شاگردی ماہ ربیع الاول ۱۲۳۱ھ تھا اب جو میں نے تامل کیا کہ تاریخ اپنی شاگردی کی کہوں سہل تر یہ ہاتھ آئی یعنی لفظ ناسخ اور لفظ رشک مل کے تاریخ حاصل ہوئی یہ عجیب قصۂ اتفاقیہ ہے "(خوش معرکہ زیبا۔ نسخۂ لکھنؤ)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے رشک کو اپنی شاگردی میں قبول کرنے سے پہلے ان کی صلاحیتوں کا امتحان بھی کیا یعنی ان کے یہاں محض سفارش کافی نہیں تھی۔ پھر اس وقت تک رشک اتنی مشق بہم پہنچا چکے تھے کہ دو غزلے بھی کہہ لیتے تھے اور تاریخیں بھی بخوبی کہہ لیتے تھے، یہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رشک کی طبیعت ابتدا ہی سے تاریخ گوئی کی طرف مائل تھی یہی سبب ہوا کہ اس فن میں انہوں نے اس حد تک امتیاز حاصل کر لیا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بقول آزاد "شاعری کی سرکار سے تاریخیں کہنے کا ٹھیکہ ملا" (آب حیات ص ۴۵۸)

چند سال اصلاح دینے کے بعد ناسخ نے میر رشک کو اس قابل کر دیا کہ وہ خود دوسروں کو اصلاح دینے لگیں۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنے تلامذہ کو میر رشک سے اصلاح لینے کا مشورہ دینا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں تنبیر شکوہ آبادی کے الفاظ بہت واضح ہیں:

"در کانپور بہ آستانہ بوس حضرت مجتہد الشعرا مغفور و مبرور (ناسخ) کہ بہ تقریب مہمان مرحوم نواب امین الدولہ بہادر تہر بودند از جواہر انواع استفادہ جیب تمنا مالا مال کردم و بعد معاودت حضرت پیر و مرشد ممدوح الصدر بہ گلستان ہمیشہ بہار لکھنؤ صانہ اللہ عن کل سوء حسب اشارت فیض بشارت جناب شان دست ارادت بہ امان استاد المحققین ملاذ المتبحرین سیدی و مولای جناب میر علی اوسط رشک دامت افادانہ زدہ عمری خوشہ چین خرمن برکات حضرت ایشاں بودہ" (منتخب العالم ص ؟)

تنبیر کے علاوہ کانپور کے اکثر تلامذہ ناسخ نے میر رشک سے کسب فیض کیا ہے جو اس حقیقت پر بخوبی دلالت کرتا ہے کہ ۱۲۴۲ھ (جلوس امین الدولہ) کے قریب ناسخ نے رشک کو اس لائق سمجھ لیا تھا کہ وہ ان کے تلامذہ کی تربیت کر سکیں۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد کچھ تو ناسخ کے اثرات اور کچھ نواب معتمد الدولہ کی خاص محل سے قرابت کام آئی اور رشک کو ان کے بڑے صاحبزادے نواب امین الدولہ تہر کی سرکار میں رسائی حاصل ہو گئی اس ملازمت کے متعلق خود رشک نے ۱۲۵۴ھ میں کہا ہے ؎

تھا مقدر سے نوکر نواب ....
کون نواب رشک مہر منیر ....
مہتر پایا تخلص انور ....
بحر میں کیونکر آئیں نام و خطاب کوزے میں کیا سمائیں نام و خطاب

پیر ناصر سدار ضیغم جنگ

حاتم اس دور میں اگر ہوتا دور گردوں تباب پر ہوتا۔

نذر اہل کمال کرتے ہیں باثمر کو نہال کرتے ہیں۔ (سراج نظم)

اور ۱۲۵۰ھ کے قریب ابن امین اللہ طوفان نے ان کو "کار کن و استاد امین الدولہ مہر" لکھا ہے (ص ۔)

۱۲۴۳ھ میں نواب معتمد الدولہ معزول ہو کر کانپور کے لئے روانہ ہوئے تو میر رشک بھی ساتھ ہی تھے، کانپور میں اس قافلہ نے جوہی کے میدان میں قیام کیا اس کا حال رشک نے ایک غزل میں نظم کیا ہے چند شعر یہ ہیں ؎

کب آگے جانتے تھے ہے کدھر میدان جوہی کا نظر آتا ہے اب آٹھوں پہر میدان جوہی کا

مزا ہے جب نکلئے خیمے سے وسعت دکھاتا ہے ادھر میدان جوہی کا ادھر میدان جوہی کا

مکانات و فضا سے لکھنؤ کا دھیان رہتا ہے ہوا کنج لحد سے تنگ تر میدان جوہی کا

وطن میں بے تکلف سیر زلف درروئے جاناں تھی ہے پیش چشم اب شام و سحر میدان جوہی کا۔

نماز استغاثہ بھی نہیں خضر رہ مسکن، دعا ہے بے اثر یا بے اثر میدان جوہی کا

چلے تو بھی وطن سے بے وطن جیسا کیا ہم کو جہنم اب ہے اے بیدادگر میدان جوہی کا

یہاں اے رشک دام و دد بھی آتے ہیں تو کہتے ہیں کہے جانے غم و خوف و خطر میدان جوہی کا۔

بہر حال اب میر رشک نے بھی کانپور کو اپنا مسکن بنا لیا لیکن اکثر لکھنؤ جاتے رہے ابن امین اللہ طوفان نے لکھا ہے:

" بالفعل در کانپور تشریف می دارد اکثر شریک مشاعرہ مرزا برق می شد چوں کار کن و استاد امین الدولہ مہر تخلص پسر مہین نواب معتمد ولہ مرحوم است در لکھنؤ گہگاہ رونق افروزی شود" (طوفان ص ۔)

نواب امین الدولہ بھی اپنے استاد سے نہایت محبت رکھتے اکثر سفر میں ساتھ لے جاتے تھے رشک کے حسب ذیل بیانات اس حقیقت پر دال ہیں۔ ع

ساتھ ان کے جو لکھنؤ آیا

سنگم کی سیر دولت نواب سے ملی کاشی کی مچھلیاں نظر آئیں پراگ میں

ظاہر ہے کہ امرار اور نوابین شعرار کی سرپرستی اس لئے بھی کرتے تھے کہ یہ موقع قصیدہ کہ کر ان کی دعا گوئی کرتے رہیں گے لیکن نواب امین الدولہ کا معاملہ اس سے قدرے مختلف تھا رشک کے یہ شعر قابل لحاظ ہیں ؎

کیوں مدح و ذم مردم دنیا میں ہوں مصروف روزی مجھے بے فکر دیا کرتا ہے رزاق

نوکر بھی ہوں اسکا کہ جو تقریب کوئی ہو۔ تکلیف نہ دے قطعہ کی اللہ رے اخلاق

اس طرح رشک کو آزادانہ طور پر شعر و ادب کی خدمت کا موقع ملا اور انہوں نے اصلاح زبان کی طرف توجہ کی۔ ان کے

دیوان کا مطالعہ کریں تو اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اشعار زبان و بیان کے مختلف مسائل، مصطلحات، اور محاورات کی افہام و تفہیم[1] کے لیئے کہے گئے ہیں۔ زبان و بیان کے معاملے میں بھی رشک کے نظریات بڑی حد تک آزادانہ ہیں، معاصر شعراء ہی نہیں بلکہ بیشتر تلامذہ ناسخ بلکہ کہیں کہیں خود ناسخ کی رائے سے بھی اختلاف ملتا ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ ان کو محقق علم و شعر کہا گیا (سراپا سخن ص۲۳۵، کلیات منیر وغیرہ) اور وہ خود بھی اسی پر فخر کرتے تھے کہ ؎

سقم و غلط کے حرف مرے حرف گیر ہیں　　تحقیق لفظ کرنا ہے تنبیہ مات دن[2]　(دیوان دوم)

کانپور میں انگریزوں کا عمل تھا وہاں کے ماحول پر انگریزی اثرات حاوی تھے بہت سے ایسے معاملات تھے جو کانپور والوں کے لیئے روز کی باتیں تھیں۔ اہل دہلی اور لکھنؤ ان کا تصور کا بھی نہیں کر سکتے تھے تفصیل کا موقع نہیں صرف چند درج ذیل ہیں ؎

اسکول ۔ الف مفتوح، خانہ خواندن اطفال نصاریٰ (نفس اللغۃ)

انگلش: انگلشیہ۔ مشاہرہ باشد کہ بیمار ال دبیران ملازم انگریزاں تادم زندگی یابند و آں نیم مشاہرہ سابق ایں کس باشد (نفس اللغۃ　)

باراں کوٹ۔ جامہ بود ... کہ مردمان فوج انگریزی در ایام سرما و برشگال پوشند (نفس اللغۃ ص۴۲)

پانی ناپنا: سزائی مجرماں باشد نہ حکم نصاریٰ بدیں صورت کہ آں گنہگار را بہ دریای مغرب بہ فرستند کہ آب پیمائی کند تامدت معین (نفس اللغۃ ص۹۸)

یہ نہیں ہے کہ ان میں سے سبھی چیزیں وہ ہیں جن کا بدل دہلی اور لکھنؤ میں نہ تھا لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان سب کے ساتھ مغربی تہذیب کا جو مخصوص تصور وابستہ تھا وہ یہاں پہلے سے ہرگز موجود نہیں تھا اور بعض چیزیں تو بہت نئی تھیں مثلاً واٹر ورکس جس کے لیئے رشک نے "پانی بنانا" لکھا ہے۔ اس طرح یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ کانپور کے مخصوص ماحول میں حسب ضرورت بہت الفاظ اور تراکیب وضع کئے گئے، ان سے وابستہ نئے تصورات عام ہوئے اور انہوں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا شعر و ادب بھی اس ماحول سے دامن بچا نہ سکا۔ پھر میر رشک کی آمادانہ تحقیق و تلاش نے اس میں جدت کے کئی پہلو تلاش کر لیئے۔ چونکہ کانپور میں نواب امین الدولہ سب سے زیادہ بارسوخ امد با اثر رئیس تھے اور میر رشک ان کے استاد تھے اس لیئے کانپور کے شعری ماحول پر انہیں کا رنگ حاوی رہا۔ اس طرح کانپور میں شعر و سخن کا جو طرز عام ہوا اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے وہ لکھنؤ سے[3] ممتاز رہا اس کی تفصیلات انشاءاللہ پھر کسی موقع سے عرض کرونگا بہر حال رشک نے اپنے کلام کے متعلق خود رائے ظاہر کی ہے یہ ہے ؎

شعر گوئی میں تمہیں سب سے نیا پاتے ہیں　　نہ وہ بندش نہ وہ لفظیں ہیں پرانی اے رشک

رشک کی طبیعت میں قناعت اور استغنا کا عنصر کافی معلوم ہوتا ہے۔ ایک قطعہ میں کہتے ہیں ؎

---

(۱) اس مقصد کے تحت رشک نے زبان اردو کا ایک لغت بھی تیار کیا جس کا نام نفس اللغۃ تھا اس کا صرف ایک حصہ اب تک شائع ہو سکا ہے۔

(۲) لفظ تحقیق عام طور پر مونث بولا جاتا ہے اور جلال شاگرد رشک نے بھی لکھا ہے کہ "تحقیق وغیرہ مونث آتے ہیں۔" (مفید الشعراء ص۴۵)

(۳) [illegible]

آتشِ شوق کسی وقت نہ بجھنے پائے | جلائے سینہ سرِ گلخن و مہر دینا
تیرے صحرائے تنگا پو میں نہ تھکنے پائیں | پاؤں دنیا نوا نہیں طاقت صرصر دینا
گنج بے رنج قناعت جو عطا کرتا ہو | مخزن و معدن دنیا سے فزوں تر دینا
اور اگر تیری مشیت ہی یونہی گزرا ہے | حرص دنیا تو نہ دینے کے برابر دینا

ایک دوسرے قطعہ میں کہتے ہیں

وہ موحد ہوں کہ دن رات ہے رزاق سے دعا | ایک سرکار سے روزی مری جاری رکھنا

اور یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ وہ آخر تک نواب امین الدولہ ہی کے دامن سے وابستہ رہے۔ یہاں تک کہ ۱۲۶۰ھ میں جب نواب نے کربلائے معلیٰ کا ارادہ کیا تو میر رشک بھی ان کے ساتھ ہی گئے رشک کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدت سے اس سفر کے متمنی تھے لیکن "بے سرو سامانی" آڑے آتی تھی ؎

اگر واجب خدا کی بندگی ہے | زیارت بھی تو اے رشک ایسی ہی ہو
نصیب وزائرِ رہ کی کوتہی ہے | دعا پانچوں نمازوں میں یہی ہے
مری مشکل ہو یارب سہل و آساں | بحقِ غربتِ شاہِ خراساں

ایک دوسرے موقع پر انہوں نے اس طرح دعا کی ؎

نہ ابتدائے سفر کوئی سہوں میں | اکیلا دوستوں سے بھی نہ ہوں میں
صحیح و سالم و غانم رہوں میں | کہیں آمین قدسی جب کہوں میں
خداوندا مجھے پہنچا نجف میں | مروں میں کربلا میں یا نجف میں

رشک کی یہ سب دعائیں پوری ہوئیں اور وہ ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ نجف کی طرف روانہ ہوئے اس موقع پر انہوں نے خوشی سے کہا ؎

مجیب الدعوۃ نے سن لیں دعائیں | اثر بخشا ہماری التجا میں

خواجہ عبدالرؤف عشرت نے لکھا ہے کہ

"آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے اور وہیں انتقال کیا کربلا جانے کا سبب یہ واقعہ ہوا کہ رشک کا ایک پوتا تھا۔ اور ایک ہی لڑکا تھا پہلے لڑکے کا انتقال ہوا اس کے بعد پوتا ابھی سن شعور تک نہ پہنچا تھا کہ دفعتاً بیمار ہو کر جمادی الاول کی چھبیس تاریخ روز پنجشنبہ ۱۲۶۵ھ کو انتقال کیا۔ اس صدمۂ جانکاہ سے متاثر ہو کر آپ کربلائے معلیٰ چلے گئے اور پھر واپس نہ آئے۔

(آبِ بقا صفحہ ۲۰)

پچھلے صفحے کا حاشیہ:

لکھنؤ کے ماحول کو عام طور پر یک رنگی کہا جاتا ہے لیکن غور کیجئے تو وہاں مختلف انداز اور اسالیب کم و بیش ہر دور میں ملتے ہیں سودا کا طرز عام ہوا تو میر کے اثرات بھی کم نہ تھے۔ انیس کو قبول عام حاصل تھا تو دبیر بھی خواص میں نامقبول ہرگز نہ تھے۔ ناسخ کو اگرچہ دور کا بڑا استاد تسلیم کیا گیا تو آتش کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے۔ لیکن کا پور کے ماحول پر اس زمانے میں صرف ایک شاعر یعنی میر رشک کے اثرات حاوی ملتے ہیں

اس تذکرہ میں کربلا جانے کا سال ۱۲۳۰ھ لکھا ہے اس کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب کی رائے ہے کہ یہ مرتجاً چھاپے کی غلطی ہے۔ (طوفان صد ۸۳)

صحیح ۱۲۶۷ھ ہے اس کے لئے عشرت کو الزام دینا فضول ہے. کربلا جانے کے سبب کے متعلق استاذی قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں۔

"رشک کے بیٹے علی ضامن شوق ان کے کربلا جانے کے بہت بعد تک زندہ تھے جیسا کہ دیوان منیر سے ثابت ہے (طوفان ۸۲)

اس سلسلے میں بھی غالباً "ایک لڑکا" کی جگہ "ایک ہی لڑکا" کتابت کی غلطی ہے کیونکہ تمام تذکرہ نویسوں نے شوق کو رشک کا "بڑا بیٹا" کہا ہے۔ دیوان منیر سے رشک کے ایک پوتے کا اسی تاریخ کو انتقال کرنا ظاہر ہے جس دن عشرت نے ذکر کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رشک کو انتہائی قلق ہوا چنانچہ منیر کا ایک شعر یہ ہے۔

شد سید عالم بہ چشم حضرت استادمن　　منخسف گردید در ظلمات قرآن ماہ حیف

لیکن خود رشک نے ایک موقع پر کہا ہے۔

فلک در پے ہے راحت میں رہوں کیا　　فساد مردم دنیا کہوں کیا۔

نہیں طاقت تحمل کی سہوں کیا　　کروں تدبیر کیا اسکی کہ ہوں کیا۔

مری مشکل ہو یارب سہل و آساں　　بحق غربت شاہ خراساں

ممکن ہے رشک کی طبیعت بیٹے پوتے کی موت سے اچاٹ ہوگئی ہو لیکن یہ سبب نواب امین الدولہ کی ہجرت کا نہیں ہوسکتا، دراصل نواب امین الدولہ اپنے والد کے انتقال کے بعد برابر اس کوشش میں تھے کہ انہیں پھر شاہ لکھنؤ کے یہاں وزارت مل جائے چنانچہ انہوں نے خود کہا ہے۔

مجھ کو میرا کار آبائی ملے پھر اے خدا　　پھر بلائے شاہ گردوں اقتدار لکھنؤ

رشک نے بھی ایک مقطع میں یہی بات کہی تھی۔

وزیر ہند ہوں نواب مستطاب اے رشک　　غرض جو ہے تو یہ ہے بادشاہ سے ہم کو

نواب جب اپنی کوششوں کی طرف سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے یہاں کا رہنا مناسب نہ سمجھا اور ہجرت کر گئے

اس سلسلے میں رشک کی ایک رباعی قابل لحاظ ہے۔

دشمن شدہ روزگار وقت مدد است　　برہم شدہ کاروبار وقت مدد است

فریاد کجا برم چہ گویم چہ کنم　　ای کاظم نامدار وقت مدد است

بہر حال ۱۲۶۷ھ میں کانپور سے روانہ ہوکر ۱۲۶۸ھ کے اوائل میں یہ قافلہ بمبئی پہنچا اور کچھ دن وہاں سے عراق چلا گیا۔ ۱۲۶۹ھ میں نواب امین الدولہ نے انتقال کیا کاظمین میں دفن ہوئے۔ رشک نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔

(باقی صد ۸۹ پر)

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ آپ
جو الفاظ استعمال کریں اُن کے معانی سے آپ پوری طرح واقف ہوں
اس سلسلے میں
اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری
آپ کے بہترین معاون ہوسکتی ہے

افاداتِ اکبر

حضرت اکبر الہ آبادی کی بہت سی تحریریں ایسی ہیں جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے ایسے اشعار تو اب کم ملتے ملتے ہیں جو منظر عام پر نہ آئے ہوں لیکن مکتوبات کا بڑا حصہ ایسا ہے جو ضائع ہو گیا یا جس کے شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ حضرت اکبر کے پوتے جناب سید محمد مسلم رضوی (خلف سید عشرت حسین) کے پاس اکبر سے متعلق نوادر کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ مسلم صاحب نے ان نوادر کو "قومی زبان" میں شائع کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے "افاداتِ اکبر" میں اکبر کی غیر مطبوعہ تحریروں کے ساتھ ان کی غیر معروف تحریریں بھی شائع کی جائیں گی نیز مشاہیر کے ایسے خطوط بھی پیش کیے جائیں گے جو حضرت اکبر کے نام ہیں۔ اس مرتبہ تین تحریریں پیش کی جا رہی ہیں۔ سب سے پہلے اکبر کا ایک خط ہے جو سید عشرت حسین کے نام لکھا گیا تھا، عشرت مرحوم اس وقت لندن میں زیر تعلیم تھے۔ دوسری تحریر ایک کتاب کی تمہید ہے۔ اکبر نے ۱۸۸۵ء میں والفرڈ اسکاٹ کی کتاب "فیوچر آف اسلام" کا ترجمہ "اسلام کی حالت آئندہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ مکتوبات سے قطع نظر، اکبر کی نثر کے نمونے بہت کم ملتے ہیں اس لئے یہ مختصر تمہید خاص اہمیت رکھتی ہے۔ عبدالحلیم شرر کا ایک خط بھی شائع کیا جا رہا ہے جو انھوں نے حضرت اکبر کے نام لکھا تھا۔ آخر میں ان نوادر کی اشاعت کے لئے سید محمد مسلم رضوی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

(ادارہ)

مکتوب اکبر بنام سید عشرت حسین

مرزاپور ۳/۸ روز پنجشنبہ

ڈیر عشرتی۔ اللہ تم کو تمھاری مشکلات پر غالب کرے۔ سیدھی اور وسیع سمجھ عطا کرے۔ خوش رہو۔ خوش رکھو۔ تمھارے خطوط پہنچے، بدریافت خیریت اطمینان ہوا۔ کیمبرج کی عمارتوں کی تصویریں خوب ہیں۔ ٹرنٹی کالج کا کیا اچھا منظر ہے۔ کرائسٹ کالج جس میں تم داخل ہو گے اس کی تصویر نہیں ہے۔ شاید وہ بہت عمدہ عمارت نہیں ہے۔ خیر کرائسٹ

کے نام کو وہاں سب پر فوقیت ہے۔

تم نے بہت اچھا کیا کہ ادن کابلی صاحب سے رسم نہیں بڑھائی۔ تمھاری ایسی احتیاطوں سے مجھ کو بہت مسرت ہوتی ہے۔

کیا مسٹر شاہد حسین کیمبرج میں رہ کر پڑھیں گے؟ کیا وہ بھی بیرسٹری کے لئے گئے ہیں۔ سنا ہے کہ بہت عیش دوست اور نہایت آزاد طبع ہیں لیکن امید ہے کہ تم پر ایک بزرگانہ نظر رکھیں گے رشتے میں سالے ہوتے بڑا سالہ سسر کی جگہ ہوتا ہے۔ خیر تم اپنی سیدھی چال چلو۔ اپنے پڑھنے لکھنے میں مصروف رہو۔ مسٹر شاہد حسین غالباً پرسا نویں کی تخصیص سے تم سے محبت کا برتاؤ کریں۔ بے شک یہ بات اطمینان کی ہوگی۔

یہ تو بتاؤ کہ تم جس مکان میں رہتے ہو اوس کے سلسلے میں اور مکانات بھی ہیں یا تمھارا مکان صرف میدانوں سے محدود ہے۔ اگر اور مکانات کے سلسلے میں ہے تو دوسرا کمرہ جس میں کوئی رہتا ہو تمھارے کمرے سے کتنے فاصلے پر ہے۔
ہم لوگوں کو یہ تردد رہتا ہے کہ تم رات کو تنہا اپنے کمرے میں رہتے ہو۔ شاید کوئی ضرورت ہو تو کون جواب دینے والا ہے۔

ہم لوگ یہ بھی سننا چاہتے ہیں کہ تمھارا کھانا کون پکاتا ہے اور علٰحدہ پکتا ہے یا یکجائی۔ کالج کھلنے پر شاید آبادی بڑھ جائے اور تمھاری معاشرت میں کچھ تبدیلی ہو۔

کھانے کے نسبت تم حکم خاص دیا کرتے ہو یا مہتمم اپنے امتیاز سے ردو بدل کرتا رہتا ہے۔

یہ بتاؤ کہ اسٹڈی کا کیا حال ہے کچھ پراگرس کیا یا نہیں۔ دقت تو ضرور معلوم ہوتی ہوگی شاید گھبراتے بھی ہو۔

لیکن محنت سے راحت ہے یہ یاد رکھو اللہ تعالیٰ اس محنت اور وطن سے دوری کا اچھا بدلا تم کو عنایت کرے گا۔ تین برس کی تلخی انشاء اللہ تمھاری ساری عمر کو شیریں کر دے گی۔ اور اب تو پونے تین برس رہ گئے۔

تم نے محض طلب علم اور افزائش و بقائے عزت خاندانی کے لئے یہ سختی اٹھائی ہے۔ کچھ یہ غرض نہ تھی کہ لندن کی سیر کرو یورپ کے تماشے دیکھو۔ غفلت میں پڑو۔ جھوٹی شیخی سیکھو۔ پس تمھارا فعل حسن عمل میں داخل ہے اور یہ آیت قرآن مجید کی ہے۔ واللہ لا یضیع اجر المحسنین (اللہ نیکی کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کرتا) خدا تم کو کامیاب کرے گا۔ تم نے جو پرچہ میگزین کا بھیجا ہے پہنچا اور وہ مضمون جو بچوں کی تعلیم ابتدائی پر اُس میں چھپا ہے میں نے پڑھا۔ واقعی تم نے نہایت مفید مضمون منتخب کیا اسی وقت میاں نے تمھاری ماں سے کہا کہ ہاشم جب سو چکے اور آنکھ کھل جائے تو اس کو جلد اٹھا لیا کرو اس بات کا انتظار نہ کرو کہ جب رو دے تب اٹھاؤں۔ میں نے وہ مضمون حاجی عبدالرشید خاں صاحب کو دے دیا ہے کہ اردو میں ترجمہ کر دیں۔ پرسا نویں بھی بھیجوں گا۔ اس کی ہدایتیں لائق عمل ہیں۔ انشاء اللہ ہاشم زندہ و تندرست رہا تو اس کی شروع تعلیم باقاعدہ کا وہی زمانہ ہو گا جب تم کو اللہ تعالیٰ خیر و خوبی سے یہاں پہنچا دے گا۔ یعنی تمھاری واپسی سے چند روز کے بعد اس کا

مکتب ہوگا - وہ بہت خوش نصیب لڑکا ہوگا کہ تمھارے اہتمام و ہدایت میں تعلیم و تربیت پائے گا۔

تمھارے دوست محمد میاں جونپوری حیدرآباد پہنچے وہاں سے مجھ کو لکھا ہے کہ میں ولایت جانے کو ہر طرح تیار تھا لیکن یہاں ایک نوکری مل گئی ہے اگر مستقل نہ ہوگیا تو شاید قصد کروں گا - یہ نہیں لکھا کہ کیا نوکری مل گئی ہے - یہ پوچھا کہ عشرت میاں کس فن کے لئے گئے ہیں - میں نے جواب لکھ دیا -

اصل یہ ہے کہ انگلستان جانا سہل نہیں ہے - بہت صرف، بڑی دقتیں ہیں اور پھر ہر شخص کو یہ بات حاصل نہیں ہے کہ وہاں سے واپسی پر اس کے لئے عمدہ پراسپکٹس ہندوستان میں موجود ہوں - یہ دوسری بات ہے کہ دولت مند ہو اور اپنی دولت کو اڑانا شروع کرے -

میں نہیں جانتا کیا پولیٹکل مصالح ہیں لیکن یہاں گورنمنٹ ہند نے حکم جاری کر دیا کہ والیان ملک و رئیسان ہند میں سے کوئی رئیس بغیر اجازت گورنمنٹ کے سفر یورپ نہ کرے اور اجازت چند شرائط سے ملے گی - تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ ایسے سفروں سے یہ رئیس زیر بار ہوتے ہیں - انتظام ریاست میں خلل پڑتا ہے اور وہ لوگ کوئی اخلاقی فائدہ حاصل نہیں کرتے - البتہ خراج ہو جاتے ہیں -

میں اب تک فیصلہ نہ کر سکا کہ تمھاری پوری تصویر زیادہ اچھی ہے یا بسٹ - میں تو بسٹ کو ترجیح دیتا تھا اور وہ فیشنیبل بھی ہے لیکن اکثر لوگ پوری تصویر کو ترجیح دیتے ہیں - رئیسان علی گڑھ اور بعض دیگر احباب کو میں تمھاری تصویر بھیجنا چاہتا ہوں، پس کسی مناسب موقع پر نصف درجن تصویریں اور بھیج دینا - کچھ جلدی نہیں ہے - اب موسم اچھا آتا جاتا ہے انشاءاللہ میں بھی اپنی تصویر کھچوا کر بھیجوں گا - شوق اور فیشن کی بات ہے ورنہ تصویر سے کچھ تسکین نہیں ہوتی -

میں تمھاری تصویر دیکھ کر رکھ دیتا ہوں اور پھر تصور کرتا ہوں تو تم نظر میں نہیں پھرتے بلکہ وہی کیبنٹ سائز کی تصویر نظر میں پھرتی ہے - خوب کہا ہے کسی کہنے والے نے -

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

روح رواں اور موج خیالات ہر پل ہر لحظہ چہرے کی شان اور رنگ میں تبدیلی پیدا کرتی رہتی ہے - تصور صرف ایک لمحہ کا رنگ دکھاتی ہے - اور پھر چہرے پر اس خیال کا رنگ بھی ہوتا ہے کہ میں تصویر کھنچوا رہا ہوں -

اللہ اللہ جن لوگوں نے محبت کے اثر کو سمجھا ہے کیسے کیسے خیالات ظاہر کئے ہیں - ایک شاعر کہتا ہے -

ہر سنگ کہ بر سینہ زدم نقش تو بگرفت
آں ہم صنمے بہر پرستیدن من شد

ANY STONE THAT BEAT (OR STRUCK) ON MY BREAST RECEIVED YOUR IMPRESSION (OR WAS IMPRESSED WITH YOUR IMAGE) THAT ALSO BECAME AN IDOL FOR ME TO WORSHIP.

حضرت یعقوب کے پاس حضرت یوسف کا کوئی فوٹو نہ تھا، لیکن پیارے یوسف نے مصر سے اپنا پیراہن بھیجا تو آپ کو پہلے ہی اس کی بو پہنچ گئی۔ اس پر کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے مصر سے ان کے پیرہن کی بو سونگھ لی پھر اس وقت کیوں نہ دیکھ سکے جب یوسف کنعان کے کنویں میں پڑے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی ہماری طبیعت کی حالت کوندتی ہوئی بجلی کی طرح ہے دم بھر میں ظاہر دم بھر میں پوشیدہ۔ کبھی میں نہایت بلند مقام پر رہتا ہوں۔ کبھی اتنا پست ہو جاتا ہوں کہ اپنے قدم کی پیٹھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر درویش ایک حالت پر رہتا تو دونوں جہان سے بے پروا ہو جاتا۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے کس خوبی سے اس کو نظم کیا ہے ؎

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند[1] | کہ اے روشن گہر[2] پیر خردمند
ز مصرش بوئے پیراہن شنیدی | چرا در چاہِ کنعانش نہ دیدی
بگفت احوالِ ما برقِ جہاں[3] است | دمے پیدا و دیگر دم نہان است
گہے بر طارم اعلیٰ نشینم | گہے بر پشت پائے خود نہ بینم
اگر درویش بر حالے بماندے | سر دست از دو عالم برفشاندے

ہاں بھئی خوب یاد آیا۔ جب تم کو اطمینان ہو اور موسم مناسب ہو تو اپنی تصویر کیبنٹ سائز کھنچوا کر نصف درجن یا کم سے کم تین عدد بھیج دینا۔ اور کسی موقع پر گروپ لیا جاوے تو وہ بھی بھیج دینا۔

اس وقت تمھاری کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے۔ دل چاہتا ہے کہ سامنے رہے۔ تم نے جو کارڈ بھیجے ہیں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ ان پر کن مقامات کی تصویریں ہیں۔

پنجشنبہ ہے خط ڈاک میں پڑے گا لہٰذا ختم کرتا ہوں۔ تمھاری ماں کہتی ہیں کہ عشرت بلا ناغہ ہر ہفتے خط بھیجا کریں فرصت نہ ہو تو دو ہی سطریں سہی۔ اس اثنا میں تمھارے نام تین خط آئے علیحدہ لفافہ میں بھیجتا ہوں۔ میں نے کسی اخبار میں دیکھا ہے کہ ولایت کے تار کا محصول کم ہونے والا ہے خدا کرے ایسا ہو۔ لیکن عبدالرشید خاں صاحب کہتے تھے کہ وہاں یہ بھی جائز ہے کہ اپنے پورے ایڈرس کو کوئی شخص کوڈ میں لکھوا کر کوئی خاص حرف اپنے نام لکھا دے۔ مثلاً شیخ لندن

---

[1] یعنی حضرت یعقوب [2] عالی خاندان [3] جہاں یعنی کوندنے والی (یہ حواشی خود اکبر نے لکھے ہیں)

میں یہاں سے اس پتہ سے تار بھیجوں تو لندن کا ٹیلیگراف آفس کوڈ میں دیکھ کر تمھارے ایڈریس کو معلوم کرلے گا اور تار بھیج دے گا - خدا جانے یہ بات کہاں تک صحیح ہے ۔

ہاشم کو غالباً دانتوں کی آمد ہے - کیونکہ آنکھیں بھی کچھ نا صاف ہیں - تمھارے چھوٹے ابا اب امریکا کے ڈاکٹروں کا علاج کررہے ہیں - میں نے 75 Rs ان کو اور بھیجے کیا کروں - خدا ان کو شفا دے - اب ان کا پتہ ہے

A PATIENT IN DR. PLACES SANITARIUM,

51, PARK STRET, CALCUTTA

نہایت رعایت سے سو روپیہ ماہوار پر وہ وہاں لے گئے ہیں - ان کے سوا اور کوئی ہندوستانی نہیں ہے ۔

YOUR FATHER-IN-LAW ALSO

CELEBERATED THE PRETARIA

VICTORY. I HERE WITH SEND YOU A

CUTTING FROM THE PIONER OF 15 th JUNE

وہاں کے بجے صبح ہوتی ہے اور کے بجے شام دن بڑا ہوتا ہے یا رات - تم لوگ تاپتے ہو یا نہیں - اکیلے کمرے میں تم پریشان تو نہیں ہوتے ۔

اچھا بٹیا خدا حافظ و ناصر

امامیں دعا کہتی ہیں - تمھاری پھوپھی اماں دعا کہتی ہیں - افسوس ہے دوسرا طوطا اٹلی یا آسٹریلیا والا بھی اڑ گیا - نوکروں کی غفلت سے - اب انشاء اللہ تم جب آنا تو میرے لئے عمدہ چڑیاں لانا ۔

کتاب اسلام کی حالت آئندہ کی تمہید

اپنے برادران اسلامیہ کے سامنے کتاب فیوچر آف اسلام کا ترجمہ پیش کرنے میں مجھے کچھ زیادہ تمہید کی ضرورت نہیں ہے - مصنف نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں عام اس سے کہ وہ ہمارے حسب مراد ہوں یا نہ ہوں ان کی صحت تمام تر لائق تسلیم ہو یا نہ ہو ایسے نہ تھے کہ مجھ کو مسلمانوں کی اطلاع کے لئے اس ترجمہ کا شوق نہ پیدا ہوتا - زمانہ کی رفتار نے مسلمانوں کے دلوں کی ایک غیر معمولی حالت کر دی ہے ایسے وقت میں مجھ کو امید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا اگر سوچنے والی طبیعتوں کے دائرہ خیال کو وسیع کرنے کے لئے کچھ محنت اٹھائی اور اسلام کی مجموعی پولیٹیکل اور مذہبی حالت کی نسبت انگلستان کے ایک عالی رتبہ اور ذی علم شخص کی رائے سے ان کو مطلع کیا ۔

مصنف نے یہ کتاب صرف اپنے ہم ملکوں اور بالخصوص پارلیمنٹ انگلستان کو اسلام کی حالت پر توجہ دلانے کے لئے تصنیف کی تھی - ان کا یہ مقصود نہ تھا کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو یا اس کا ترجمہ کیا جائے - مسٹر حمید اللہ سلمہ اللہ نے ایک

جلد کتاب انگلستان سے اپنے پدر عالی رتبہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے ملاحظے کو بھیج دی تھی۔ مولوی صاحب ممدوح کی اجازت سے میں نے اوس کتاب کو پڑھا اور اس کے مضامین نے اوس کے ترجمہ پر مجبور کیا۔

ہنوز ترجمہ ختم نہ ہوا تھا بلنٹ صاحب خود ہندوستان میں تشریف لائے اور بمقام کلکتہ مجھ کو ان سے ملنے کی مسرت و عزت حاصل ہوئی انھوں نے ایک دوسرا دیباچہ بطور ضمیمہ دیباچہ اول کی تحریر فرما کر مجھ کو دیا۔ جس کا ترجمہ میں اس کتاب کے ساتھ شامل کرتا ہوں۔

سلطنت ترکی کے قائم رہنے کی نسبت مصنف کو جو مایوسی تھی یہ دیباچہ اوس مایوسی کو ضعیف کرتا ہے۔ مصنف نے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ سلطنت ترکی کی نسبت بعض اطلاعیں ان کو خود علمائے مصر و عرب سے حاصل ہوئی ہیں اور وہ ان کی صحت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس ترجمہ کے حاشیہ صفحہ ۱۰ کی سطر آخر میں پندرہ سو کی جگہ پندرہ ہزار پڑھنا چاہیے۔ مصنف کو معلوم نہیں کہ کتاب انگریزی میں کیوں کر یہ غلطی واقع ہوئی۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ مسٹر بلنٹ کی ان تمام اسپیچوں کو جو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں انھوں نے کہیں اور ان تمام ایڈریسوں کو جو مسلمانوں اور ہر مذہب کے علمائے اسلام کی جانب سے ان کی خدمت میں پیش ہوئیں اور اس خط و کتابت کو جو باستصوابِ لارڈ رپن گورنر جنرل ہند کے درمیان مسٹر بلنٹ اور گورنمنٹ حیدرآباد کے در باب قائم کرنے ایک یونیورسٹی یعنی دارالعلم کے وقوع میں آئی۔ مسلمانوں کی اطلاع کے لئے اس کتاب کے ساتھ شامل کردوں۔ لیکن اس ترجمہ کے شائع ہونے میں بہت دیر ہو چکی تھی اور زیادہ دیر نامناسب تھی۔ جہاں تک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے سلسلہ خیالات کو ذرا بھی برہم نہیں ہونے دیا۔ فقروں کی ترکیب کی پیچیدگی دور کی ہے معانی کو کامل اور روشن کرنے کے لئے ایک لفظ کے ترجمہ میں حسب ضرورت دو دو اور تین تین لفظ لکھ دیئے ہیں۔ لیکن خیالات پیچیدہ کا سہل کرنا میرا کام نہ تھا۔ بااین ہمہ ناظرین کتاب سے امید ہے کہ میری بے بضاعتی اور کم فرصتی کے لحاظ سے وہ مجھ کو معذور رکھیں گے اگر اس ترجمہ میں کچھ غلطیاں پائی جائیں۔ چھاپے اور کتابت کی غلطی تو ایک غیر ضروری چیز ہے۔

اب میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے ارشاد و تحریک نے مجھ کو محنت ترجمہ پر مستقل رکھا۔ جناب کنور لطف علی خاں صاحب رئیس طالب نگر و اسپیشل مجسٹریٹ سول نے ایک فیاضانہ مدد کی اور ایک بڑا حصہ مصارف طبع کا عنایت کیا جس کا میں دل سے شکر گزار ہوں۔ اب ناظرین ورق الٹیں اور مصنف کی باتیں سنیں فقط۔

سید اکبر حسین الہ آبادی
مقام علی گڑھ
۲۵ مارچ ۱۸۸۳ء

مکتوب عبدالحلیم شرر

محبوب پورہ - جام باغ
حیدرآباد - دکن

۱۱ر رمضان ۱۳۲۶ھ

بندہ نواز - سلام نیاز

حضور بندگان عالی کو اپنے اور اپنے عہد کے حالات قلم بند کرانے کا شوق ہوا۔ قرعۂ انتخاب میرے نام پڑا اور تقدیر نے پھر خاک دکن میں لا کھڑا کیا -

اگرچہ نہ وہ دل کا جوش رہا - نہ وہ دماغ رہا - نہ وہ حوصلہ ہے نہ وہ جولانیٔ طبع شرر، جب خاک ہوگیا اس وقت اس سے گرمیٔ طبع کی امید کی گئی ہے - دعا کیجئے (اس لئے کہ اب آپ ولایت مآب ہیں) کہ خدا عزت و آبرو سے نباہ دے یہاں مجھے ایک اور کام دیا گیا ہے وہ یہ کہ ایک مکمل تاریخ اسلام مرتب کردوں - دونوں کاموں کے لئے جداگانہ عملے بھی دیئے گئے ہیں مگر تصنیف و تالیف میں عملہ کیا مدد دے سکتا ہے - ماجد میاں سے ملاقات ہوتی ہے - یہاں ملکی و غیر ملکی کا تعصب تو قدیم سے ہے مگر یونیورسٹی کے اسٹاف نے .... پیدا کردیا اور طرح زور نہ چلا تو مذہبی پیرایہ اختیار کیا گیا اور مولوی عبدالماجد کی پکڑ ہے جن کے بعض الفاظ ایک فلسفی کتاب میں آزادانہ ہیں - اس خبر نے ماجد میاں اور ان کے ساتھ سارے محکمہ ترجمہ و تالیف عثمانیہ یونیورسٹی کو پریشان کر رکھا ہے - خدا خیر کرے مگر اب شاید کوئی اندیشہ نہیں رہا - والسلام

خاکسار محمد عبدالحلیم شرر

عابد رضا بیدار

اختر شہنشاہی

(۳)

۲۷۷ چشمۂ فیض۔ گوجرانوالہ، ماہواری۔ ۶ ورق اوسط ...، اجرار اپریل ۱۸۶۶ء، مالک گیان چند شوق۔

۲۷۸ چشمۂ علم پٹنہ ...، پندرہ روزہ، ۴ ورق اوسط ... مالک سید محمد اکبر شاہ ...، یکم جنوری ۱۸۶۹ء

۲۷۹ چشمۂ انصاف آگرہ۔ ہفتہ دار، ۴ ورق خورد، اجرار یکم جنوری ۱۸۷۷ء

۲۸۰ چشمۂ حیات۔ دوسرا نام اس کا اعجازِ نظامی ہے۔ مجاریہ شیخ نظام الدین اسسٹنٹ ہاسپٹل شفاخانہ پھولپور ضلع الہ آباد۔، ماہواری ۸۰ ورق خورد ... مہتمم منظفر حسین ... یکم جنوری ۱۸۸۷ء

۲۸۱ چراغ راجستان اجمیر، ہفتہ دار، ۴ ورق اوسط ...، مالک مراد علی بیمار ... ۲۹ ر نومبر ۱۸۷۵ء

۲۸۲ چراغ کعبہ بمبئی ...، ماہواری، ۱۲ ورق خورد ...، شعر و سخن کا گلدستۂ نعتیہ، مالک بلقیس جہاں بیگم۔ ایڈیٹر ناظمہ بیگم ...، اشتہار یکم جولائی ۱۸۸۵ء

۲۸۳ چمنستان سخن کانپور ... ماہواری، ۱۹ ورق خورد، ... مجاریہ حافظ عبدالحق، حقیقی مہتمم مرزا عباس حسین ہوش اثنا عشری ...، ۲۵ ر اکتوبر ۱۸۸۴ء

۲۸۴ چمن سخن گلدستہ شعر و سخن ...، ماہواری، ۸ ورق خورد۔ قصبہ آنولہ ضلع بانس بریلی ... مالک حکیم وارث علی ...، یکم جنوری ۱۸۸۵ء۔

۲۸۵ چمن ہند۔ شملہ، پندرہ روزہ، چار ورق اوسط ...، مالک عبدالقادر تائب ...، اشتہار یکم جولائی ۱۸۸۶ء

۲۸۶ چلتا پرزہ (ریاست جہاں آباد پنجاب) دہلی ...، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ... مالک میر حسین رضوی، ایڈیٹر عبدالرحمٰن ناسخ ...، ۱۶ ر جنوری ۱۸۸۷ء

۲۸۷ حدیقۂ روزگار رنگون، روزمرہ، ۲ ورق اوسط ... منیجر حکیم شیخ فرید ...، ۹ جنوری ۱۸۸۳ء

۲۸۸ حدیقۂ شعراء مدراس ... ۶ ورق خورد ہفتہ دار ...، مجاریہ میر صادق حسین ...، یہ گلدستہ ضمیمہ احسن الجرائد ہے ...، ۵ ر اپریل ۱۸۸۴ء۔

۲۸۹ حدیقۃ الاخبار — ریاست ٹونک ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ... مالک غالب علی خاں .. یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۲۹۰ حبیب القلوب — مرزا پور ... پندرہ روزہ، ۶ ورق خورد ... مہتمم شیخ عبدالرحمٰن .... ۱۵ ستمبر ۱۸۷۹ء

۲۹۱ حبیب ہند — کانپور ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، مالک پنڈت بیم نرائن .... یکم اکتوبر ۱۸۸۳ء

۲۹۲ حامیٔ ہند — قصبہ کڑا، ضلع الہ آباد، مجاریہ مولوی سید فریدالدین احمد خاں ... یکم جنوری ۱۸۸۳ء الہ آباد، ۱۸۸۵ء سے ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ...

۲۹۳ حامیٔ اسلام — دہلی ... عشرہ وار، ۴ ورق اوسط ... مالک فیض الحسن خاں ... ایڈیٹر عبدالوہاب ..... ۱۰ جون ۱۸۸۳ء

۲۹۴ حامیٔ اسلام — لکھنؤ ... ماہواری، ۱۲ ورق ... مالک شیخ عبدالغفار انصاری ... جنوری ۱۸۸۸ء

۲۹۵ حامیٔ تجارت — ضمیمہ اعتراضی، بمبئی ... ماہواری، ۴ ورق خورد ... مالک امداد علی .. اشتہار ۵ اپریل ۱۸۸۶ء

۲۹۶ حاکم — مدراس ... ایک ورق سب سے بڑا ۱۸۸۳ء

۲۹۷ حافظ صحت — لاہور ... پروپرائٹر حکیم غلام نبی ... ایڈیٹر حافظ قمرالدین ... ماہواری، ۴ ورق خورد ... یکم فروری ۱۸۷۸ء

۲۹۸ حیاتِ جاودانی — آگرہ ... عشرہ وار، ۴ ورق اوسط ... مالک بابو بھجی لال، مہتمم مولابخش ۱۸۸۱ء

۲۹۹ حرزِ جان — فتح گڑھ .. ضلع فرخ آباد، ماہواری، ۱۰ ورق خورد ... مالک حکیم اصغر حسین .. یکم فروری ۱۸۷۸ء

۳۰۰ حمایت الاسلام — لاہور، ماہواری، ۱۲ ورق خورد .. پرنٹر اسسٹنٹ سکریٹری کریم بخش .. ۱۸۸۵ء

۳۰۱ حب الوطن — کلکتہ ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، مہتمم محمد علیؔ۔ اشتہار یکم نومبر ۱۸۸۵ء ابھی تک یہ اخبار شائع نہیں ہوا۔

۳۰۲ خورشید عالم — سیالکوٹ، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ... مالک دیوان چند .. یکم جولائی ۱۸۵۲ء

۳۰۳ خورشید عالم — لاہور ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ... مالک جگناتھ ... یکم جون ۱۸۷۷ء

۳۰۴ خورشید جہانتاب — آگرہ ... مہینہ میں دو بار ... ۶ ورق اوسط ... مالک مچھو خاں ... یکم جنوری ۱۸۷۱ء

۳۰۵ خورشید آفاق — بیلی بھیت ... مہینہ میں چار بار ... مالک حکیم مظہر احسن خاں احسن ... ۷ فروری ۱۸۸۵ء

۳۰۶ خورشید — اعظم گڑھ ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔ مالک و ایڈیٹر و کاتب الہام الٰہی موہانی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۸۸۶ء

۳۰۷ خیرخواہِ ہند — مرزا پور ... ماہواری، ۶ ورق ... مالک پادری ایف جی برجیٹ، ایڈیٹر پادری بٹ .. یکم اگست ۱۸۳۶ء

۳۰۸ خیرخواہِ ہند — دہلی ... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ... مالک لالہ مہا نرائن ... ۱۸۷۵ء

۳۰۹ خیرخواہ خلق — سکندرہ ضلع آگرہ۔ مہینہ میں دو بار۔ ۴ ورق خورد، مالک پادری سی جی ڈاب لی۔ جنوری ۱۸۶۲ء

۳۱۰ **خیر خواہ خلائق**
غازی پور... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، ناگری مشترک... مالک محمد علی خاں لکھنوی سعیدی، ۱۸۸۳ء

۳۱۱ **خیر خواہ عالم**
دہلی... مہینہ میں ۳ بار... چار ورق اوسط... مالک سید میر حسن رضوی، ایڈیٹر شاہزادہ مرزا عبدالغنی... ۱۸۷۲ء... ریاستوں کی بابت اس اخبار میں آزادانہ مضامین چھپ کر شائع ہوتے ہیں۔ خصوصاً ریاست جے پور میں تو یہ اخبار صرفِ جان سمجھا جاتا ہے اور اس ریاست کو اس اخبار سے پوری مدد ملتی ہے۔ اور اس اخبار کی تحریر پر وہاں عمل درآمد کیا جاتا ہے خلاف ریاستوں کے، اگر ریاستوں کے بارے میں نیک نیتی سے کچھ مضامین لکھے جائیں تو وہاں وقائع نگار پر سنگین جرم جمایا جاتا ہے اور اخبار ریاست میں بند کیا جاتا ہے۔ باعثِ خرابی کا یہی ہے کہ وہاں کسی نوع سے اصلاح نہیں ہو پاتی...

۳۱۲ **خیر خواہ عام**
گجرات، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد... مالک رلا رام... جون ۱۸۸۵ء

۳۱۳ **خیر خواہ پنجاب**
گوجرانوالہ، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، مالک گیان چند شوق... پہلے چھوٹے ۱۶ ورقوں پر... ۷ جون ۱۸۶۶ء

۳۱۴ **خیر خواہ اودھ**
پہلے لکھنؤ... چھوٹے آٹھ ورقوں پر... ہفتہ وار، ۲۲ مارچ ۱۸۸۴ء (سے) پندرہ روزہ ۴ ورق اوسط... فیض آباد... مالک خیراتی لال طاہر، مہتمم عابد حسین۔ یکم جنوری ۱۸۷۳ء

۳۱۵ **خیر خواہ کشمیر**
لاہور... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط... مالک پنڈت سالگرام کول... اب بڑے دو ورقوں پر... یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء

۳۱۶ **خیر خواہ اطفال**
لکھنؤ... پرچہ چھوٹے ۸ ورقوں کا... مالک پادری مسمور... مہتمم پادری کریون۔ یکم اپریل ۱۸۷۳ء

۳۱۷ **خیر خواہ اسلام**
پہلے یہ اخبار اسم بامسمّیٰ جس کی پیشانی پر جلی قلم سے یہ لکھا ہوا ہے "مبارک ہے وہ دل جس میں قومی ہمدردی جوش زن ہے" بڑے دو ورقوں پر پندرہ روزہ (بمبئی) سے یکم اکتوبر ۱۸۸۱ء کو نکلا... پھر عشرہ وار شائع ہوا... بعد اس کے حیدرآباد میں باہتمام محمد ابراہیم و کانپور میں باہتمام مومن سجاد و الہ آباد میں باہتمام حافظ محمد اسمٰعیل و کراچی وغیرہ وغیرہ میں چھپتا رہا۔ درنیولا، ماہواری ہو کر بمبئی سے نکلا کرے گا۔ مالک شیخ ریاض الدین احمد۔

۳۱۸ **خزینۃ العلوم**
سیتاپور... ۸ ورق خورد، ماہواری، مجاریہ منی لال... ستمبر ۱۸۷۹ء

۳۱۹ **خزینۃ القوانین**
لاہور... پندرہ روزہ رسالہ قانونی... ۲۰ ورق خورد... مالک سید نادر علی شاہ سیفی ۱۸۸۰ء

۳۲۰ **خادم ہند**
بمبئی... روزنامہ ۲ ورق اوسط... مالک کشن سروپ... ۱۷ مارچ ۱۸۸۳ء

۳۲۱ **خادم ہند**
یکم فروری ۱۸۸۶ء کو لاہور... سے محمد الدین مالک اخبار اشتہار جاری کیا کہ یہ اخبار ہفتہ

دار ... باہتمام سے عبدالعزیز کے ... ۴ ورق اوسط ... پر نکلے گا۔ مگر اب چھوٹے چار ورقوں پر ...، باہتمام ادکم چند یکم جولائی ۱۸۸۷ء کو نکلا۔

۳۲۲ خادم الطلباء — دہلی ...، سہ ماہی، ۸ ورق ... مالک مولوی خواجہ سید الطاف حسین حالی مدرس، اینگلو عربک اسکول، دہلی۔ ایڈیٹر منشی ذکاء اللہ خاں بہادر، پروفیسر میور کالج الہ آباد ... یکم جنوری ۱۸۸۷ء

۳۲۳ خیال یار — چھاتہ، ضلع متھرا، شعر و سخن کا ماہواری، ۸ ورق خورد کا گلدستہ۔ معاون لالہ بلدیو لال نزار ... مہتمم دیبی پرشاد ... اجرا یکم اکتوبر ۱۸۸۵ء

۳۲۴ خیال محبوب — حیدرآباد دکن ... ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ... مالک مولوی عبدالسلام عرشی ... جولائی ۱۸۸۷ء

۳۲۵ خالصہ پنجاب — ملتان ... ہفتہ، ۴ ورق خورد، مالک بھگت سنگھ ایڈیٹر بھائی فتح سنگھ ... یکم اگست ۱۸۸۴ء

۳۲۶ خالصہ گزٹ — لاہور، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ... ایڈیٹر فتح سنگھ، ۱۶ رجون ۱۸۸۶ء

۳۲۷ خضر ہند — سیالکوٹ ... ماہواری، ۳ ورق اوسط ... مالک دیوان چند ... یکم جنوری ۱۹۷۹ء

۳۲۸ خوش بہار — پشاور کا اخبار۔ اجرا نومبر ۱۸۵۴ء

۳۲۹ خلاصۂ نظائر — الہ آباد ... اجرا یکم جنوری ۱۸۸۰ء

۳۳۰ غنچۂ عشق — لکھنؤ ... ماہواری، ۱۲ ورق خورد، شعر و سخن کا گلدستہ ۲۲ مارچ ۱۸۸۵ء

۳۳۱ دارالسلام — آگرہ ... مرثیوں کا گلدستہ، ماہواری ... مالک اشتیاق حسین نظم اثنا عشری ... مہتمم مرزا عاشق حسین بزم ... اجرا اشتہار یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء

۳۳۲ دارالعلوم — میرٹھ ... مجاریہ وجاہت علی خاں مرحوم، مہتمم حکیم منقرب حسین خاں غنی ... ۱۸۶۱ء

۳۳۳ دارالعلم — مرزا پور ... پندرہ روزہ ... ۸ ورق خورد، ناگری مشترک ... ایڈیٹر شیخ عبدالرحمٰن ... یکم اپریل ۱۸۷۶ء

۳۳۴ دارالسلطنت — کلکتہ ... ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط ... پھر بتاریخ ۴ مئی ۱۸۸۱ء کو شیخ احسان اللہ سوداگر دہلوی نے باہتمام متھرا پرشاد دکھر ایڈیٹر کے جاری کیا ... اور پھر ... ہفتہ میں دوبار، ۴ ورق اوسط ... ۱۸۸۷ء میں محمد نادر نے اس کارخانہ کو خرید کیا اور ان کے صاحبزادے عبدالکریم بی اے ایڈیٹر اس کے ہیں۔

۳۳۵ دہلی سوسائٹی — سوسائٹی کی بزم متعلق کا ذکر ہے۔ یعنی علوم و حکمت و انشا کا ذکر ہے۔

دہلی محلہ بلیماران، دیوان خانہ حکیم محمود خاں ... ماہواری، ۲۰ ورق خورد، سکریٹری منشی ذکاء اللہ خاں ... اجرا یکم مئی ۱۸۷۲ء

۳۳۶ دہلی پنچ — لاہور ... مجاریہ فرحت حسین علی فرحت دہلوی، مالک اللہ دین، ایڈیٹر فضل الدین، اجرا یکم جون ۱۸۸۰ء

۳۳۷ **دھرم پرکاش** گوجرانوالہ، ماہواری، ۶ ورق اوسط... ۱۸۷۷ء پیدا اور پودا نوں اور ہر مذہب اہل ہنود کے حقانی اصول کا رہنما۔

۳۳۸ **دھرم پرکاش** قصبہ سنبھل... ضلع مرادآباد، ہفتہ وار، پانچ ورق اوسط... ایڈیٹر بنسی دھر... ۲۸ جنوری ۱۸۸۶ء

۳۳۹ **دھرم پرچارک پترکا** فتح گڑھ... پندرہ روزہ، چار ورق... مالک انبا پرشاد نے اہتمام سے صدیق حسن منت کے شائع کیا۔ یکم اگست ۱۸۸۲ء

۳۴۰ **دبدبۂ سکندری** رام پور، ضلع مرادآباد، محلہ بنگلہ آزاد خاں، ہفتہ وار، ۸ ورق خورد اوسط یوم دوشنبہ... مالک محمد حسن خان۔ مہتمم محمد حسین خاں از مطبع حسنی، اجرا ۱۸۶۷ء

۳۴۱ **دبدبۂ قیصری** بانس بریلی، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط... مجاریہ گنگا دین، مالک رودر سہائے... ایڈیٹر انتظام علی... ۱۸۷۷ء

۳۴۲ **دبدبۂ اسلام** بمبئی... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد... مجاریہ انجمن درخشاں، مہتمم محمد سعید عربی... ۱۸۸۳ء

۳۴۳ **دبیر ہند** الہ آباد۔ ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط، مالک مرزا محمد حسین... یکم مارچ ۱۸۷۷ء

۳۴۴ **دبیر ہند** مدراس... ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط... مالک مرزا قاسم بیگ، ایڈیٹر محی الدین تسنیم... یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء

۳۴۵ **دبیر مدراس** مدراس... ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں... مالک سید حسن رضا آتشی... ۱۳ جنوری ۱۸۸۴ء

۳۴۶ **دبیر الملک** بھوپال... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط... مالک سید امجد علی اشہری... ۱۸۸۱ء

۳۴۷ **دریائے لطافت** کانپور... ہفتہ وار، ۸ ورق... مالک سید لطافت حسین... یکم جنوری ۱۸۶۵ء

۳۴۸ **درفش کاویانی** لاہور، ماہواری۔ زبان فارسی، ۴ ورق خورد... مالک و وقایع نگار عبدالحکیم کلانوری، یکم جنوری ۱۸۸۴ء

۳۴۹ **دردِ دل** لکھنؤ... ہفتہ وار، ۲ ورق کلاں... مالک نواب علی محمد خاں... ۱۵ مئی ۱۸۸۵ء

۳۵۰ **دربار اکبری** دہلی... عشرہ وار، ۴ ورق اوسط... مالک افضل خاں۔ اس کا نام اکبر الاخبار بھی ہے... اشتہار یکم فروری ۱۸۸۵ء

۳۵۱ **دامن گلچیں** لکھنؤ... ماہواری، ۸ ورق خورد... بسرپرستی جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی، مالک محمد احمد قمر۔ مہتمم شیخ واجد علی بسمل از مطبع اردو پریس، اجرا یکم فروری ۱۸۸۵ء

۳۵۲

۳۵۳ **داستانِ سیاح** حیدرآباد... ۸ ورق خورد، ماہواری... مجاریہ غوث الدین... مہتمم زین العابدین مؤلف داستان۔ ایڈیٹر سید ابراہیم عفو مترجم... ۱۶ مئی ۱۸۸۳ء

۳۵۴ **دانشِ ہند** ملتان، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط... مالک پنڈت راج ناتھ، مہتمم محمد الدین، یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۳۵۵ داغ دل — بانس بریلی، ماہواری، ۸ ورق خورد... مالک حکیم سید محمد شین ... ۱۵ر جولائی ۱۸۸۷ء

۳۵۶ داغ — اجمیر، ماہواری، ۱۱ ورق اوسط، شعر و سخن کا گلدستہ... یکم جنوری ۱۸۸۸ء

۳۵۷ دعوت الحق — لاہور کا رسالہ ماہواری، اجرا یکم مارچ ۱۸۸۳ء

۳۵۸ دکن پنچ — مدراس ... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد، مالک مرزا قاسم بیگ، مہتمم محی الدین حسین تسنیم۔ استہار یکم جنوری ۱۸۸۸ء

۳۵۹ دکن پنچ — حیدرآباد دکن ... ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ... مالک کشن راؤ، مہتمم عبدالکریم ظریف، ایڈیٹر غریب الدین ... یکم جون ۱۸۸۷ء

۳۶۰ دل گداز — لکھنؤ... ماہواری ۱۰ ورق خورد ... مالک و ایڈیٹر مولوی عبدالحلیم شرر سکریٹری انجمن دارالسلام ... اجرا ۲۵ر جنوری ۱۸۸۷ء

۳۶۱ دوربین — کلکتہ ... ہفتہ وار ۲۰ ورق اوسط ... ۱۸۶۹ء

۳۶۲ دوست — دہلی ... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ... مالک اما شنکر ... یکم اپریل ۱۸۸۷ء

۳۶۳ دوست ہند — بھیرہ ضلع شاہ پور، پنجاب ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط... مالک بخشی رام لبھایا۔ ۲۳ر جون ۱۸۸۷ء

۳۶۴ دیوان گلدستہ — لکھنؤ... شعر و سخن کا پندرہ روزہ رسالہ ۔ ۵ ورق اوسط .... مالک جیکب، مہتمم گنگا پرشاد ... یکم جنوری ۱۸۶۰ء

۳۶۵ دلیس اوپکارک — لاہور... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ... مالک سالک رام ... ۱۸۸۳ء

۳۶۶ ڈبیٹنگ سوسائٹی — میرٹھ ... ماہواری، ۲۶ ورق خورد ... سکریٹری احمد حسن زاہدی ... ۱۸۶۸ء

۳۶۷ ذخیرۂ بالگوبند — آگرہ ... ماہواری، ۲۲ ورق اوسط... مالک بالگوبند ناظر تخلص گلزار دہلوی... یکم مارچ ۱۸۶۸ء مشتمل برجمیع علوم مفید و فنون کاملہ و تحقیقات جدید... تقاریر و مضامین متعلقہ معرفت الہی و حالات و دلچسپ و عجائبات روزگار و مطالب متعلقہ پسندیدہ جدیدہ۔ معہ تصاویر۔

۳۶۸ ذخیرۂ اشرف — لکھنؤ... ضمیمۂ اخبار تہذیب الآثار، ماہواری۔ اس اخبار میں تمام ہفت اقلیم کی شہروار فہرست اخبارات کی مفصل درج ہوتی ہے۔ آنریری ایڈیٹر اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی ... یکم اپریل ۱۸۸۱ء

۳۶۹ ذخیرۂ تعلیم — حیدرآباد دکن، ماہواری۔ ۲۴ ورق خورد... وقائع نگار، عزیز الدین... یکم نومبر ۱۸۸۴ء

۳۷۰ رفاہ خلائق — شاہ جہاں پور... چار ورق اوسط، پندرہ روزہ... مہتمم لالہ جگناتھ... ۱۸۸۴ء

۳۷۱ رفاہ عام — سیالکوٹ، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط... مالک دیوان چند، ایڈیٹر گیان چند۔ یکم اپریل ۱۸۷۳ء

۳۷۲ رفاہِ عام — رتلام اخبار، اجرائے اشتہار یکم جون ۱۸۸۳ء

۳۷۳ رفاہِ عام — جہلم، ضلع اٹک ... ۸ ورق خورد، پندرہ روزہ، بحکم غلام محمد خاں، ایڈیٹر دین دیال یکم نومبر ۱۸۸۳ء

۳۷۴ رفتار — لاہور، ۱۸۸۲ء میں چھوٹے چار ورقوں پر ... باہتمام بھگو رام نند کے نکلا اور ۱۸۸۳ء میں ... باہتمام منشی گلاب سنگھ کے طبع ہوا اور ۱۸۸۴ء میں ... ۴ ورق اوسط پر ... شائع ہوا ... مالک سالک رام مہتمم پنڈت ہرگوپال ایڈیٹر ... یکم جنوری ۱۸۸۲ء

۳۷۵ روہیلکھنڈ اخبار — مرادآباد ... ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط، مجاریہ شیام سروپ، ایڈیٹر ہرنام سروپ مہتمم سید ضیاء الدین حسین ... ۱۸۶۶ء

۳۷۶ روہیلکھنڈ پنچ — مرادآباد۔ ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط ... مالک منیر الدولہ سفیر الملک قاضی سید جمشید علی خاں جم، ایڈیٹر سید مہدی حسن ۱۸۷۶ء

۳۷۷ ریاضِ ہند — امرتسر ... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ... مالک محمد حسین ۱۸۸۶ء

۳۷۸ ریاض الاخبار — یہ اخبار پہلے ... خیرآباد ضلع سیتاپور سے عشرہ وار، یکم اکتوبر ۱۸۷۴ء (کو) ریاض الدولہ بہار الملک سید ریاض احمد آشفتہ رئیس بن سید طفیل احمد کرمانی کورٹ انسپکٹر درجہ اول جونپور و حافظ نظام احمد ناز رئیس نے مطبع لمعۂ درخشاں سے جاری کیا۔ اب بحکم مالکان موصوف باہتمام لالہ سیتلا بخش ... گورکھپور، ۸ ورق اوسط ... پر شائع ہوتا ہے ... از مطبع ریاض الاخبار۔

۳۷۹ ریاض الاشعار — لکھنؤ، ماہواری، ۱۴ ورق خورد ... شعر وسخن کا گلدستہ، مجاریہ ڈاکٹر محمد یوسف جنوری ۱۸۸۱ء

۳۸۰ ریاض النور — ملتان کا اخبار ... نومبر ۱۸۵۵ء

۳۸۱ ریاضِ سخن — رام پور، ضلع مرادآباد، ۱۸ ورق، ماہواری شعر وسخن کا گلدستہ ... مالک احمد علی خاں شوق ... ۲۰ جنوری ۱۸۸۵ء

۳۸۲ ریاضِ رنگیں — پرتاب گڑھ ... رائے بریلی ... ماہواری، ۸ ورق خورد شعر وسخن کا گلدستہ ... مالک حکیم محمد ظاہر کاکوروی تخلص افسر ... ۱۵ مارچ ۱۸۸۵ء

۳۸۳ ریاض النبوی — شیوراج پور، ضلع کانپور، ماہواری، ۴ ورق خورد کا نعتیہ گلدستہ۔ مالک راج بہادر زخمی اس گلدستہ کا نام فریاد زخمی بھی ہے۔ اجرا، اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۷ء

۳۸۴ ریاض المصطفیٰ — کانپور۔ ماہواری، ۸ ورق خورد، گلدستہ نعتیہ ... ضمیمہ تہذیب سخن، مالک احمد علی احمد، نومبر ۱۸۸۶ء

۳۸۵ روزنامچہ لکھنؤ — لکھنؤ ... روزنامہ، ۲ ورق اوسط۔ مالک خدا بخش خاں بنارسی۔ ایڈیٹر سید عبد البصیر حضور بلگرامی ... یکم جنوری ۱۸۸۲ء

۳۸۶ روزنامچۂ عالم — الہ آباد ... روزمرہ، ۲ ورق اوسط ... مالک ریاض الدین احمد، ایڈیٹر اخبار خیر خواہ اسلام ... اجرا اشتہار یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء

۳۸۷ روزنامچۂ ملک — کلکتہ ... روزمرہ، ۲ ورق ... مالک علی اصغر ایم - اے ... اشتہار یکم مئی ۱۸۸۵ء

۳۸۸ راجپوتانہ سوشیل سائنس کانگرس — جے پور، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، باہتمام فیض محمد خاں ... ۱۸۶۹ء

۳۸۹ راجپوتانہ گزٹ — اجمیر ... ہفتہ وار ۴ ورق اوسط، ناگری مشترک، مالک مراد علی بیمار ... ۱۸۸۱ء

۳۹۰ راجپوتانہ پنچ — ضمیمہ راجپوتانہ گزٹ، ایک ورق، ہفتہ وار ۱۸۸۱ء

۳۹۱ راجپوتانہ اخبار — اجمیر، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ... مالک دیوان بوٹا سنگھ، ایڈیٹر وزیر علی، جنوری ۱۸۶۹ء

۳۹۲ رہنمائے پنجاب — سیالکوٹ، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ... مالک سیٹھ آذر جی ... ایڈیٹر پنڈت پرن کشن ... ۲۴ ستمبر ۱۸۶۹ء

۳۹۳ رہنمائے چنگی — آگرہ، پندرہ روزہ، ۱۱ ورق اوسط ... مالک امیر الدین، مہتمم بندہ علی خاں ... جنوری ۱۸۸۲ء اس میں ممالک اودھ کی کل میونسپل کمشنر کی کارروائیاں درج ہوا کریں گی اور انتظامات و تجاویز سے بحث کی جایا کرے گی۔

۳۹۴ رہنما — لکھنؤ ... ہفتہ وار، ۴ ورق ... مکان منشی امجد علی امیر، مالک محمد احمد قمر، اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۳۹۵ رپن گزٹ — بانس بریلی ... ۸ ورق اوسط، مہینہ میں دو بار، انگریزی اردو ناگری مشترک، مہتمم بشن لال ... ایڈیٹر کشن لال ... ۲۱ جنوری ۱۸۸۵ء

۳۹۶ رپن گزٹ — موہان، ضلع اناؤ ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ... مالک سید محمد رفیع اثنا عشری ... ار جون ۱۸۸۵ء

۳۹۷ رہبر ہند — لاہور ... ہفتہ میں دو بار ... ۴ ورق اوسط ... مالک سید ناور علی شاہ سبیلی اثنا عشری، جنوری

۳۹۸ ۱۸۸۵ء سے روزانہ بھی اس کے سوائے دو ورق خورد پر ہوگیا ... یکم دسمبر ۱۸۸۵ء

۳۹۹ رہبر — مراد آباد ... لیبر پرستی راجہ کشن کنوار تعلقہ دار سیپور، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد پر باہتمام پنڈت پرتاب کشن آغا تخلص رہبر کے شائع ہوتا ہے ... ۴ جنوری ۱۸۸۸ء

۴۰۰ رفیق ہند — لاہور ... ہفتہ وار ۸ ورق اوسط ... مالک محرم علی چشتی ... ۵ جنوری ۱۸۸۴ء

۴۰۱ رفیق نسواں — یہ پرچہ قومی عیسائیاں ... بزبان اردو ہندی لکھنؤ میں اور بزبان بنگالی کلکتہ میں اردو زبان، تامل مدراس میں دو ہفتے کے بعد، عیسائی عورتوں کے لئے ۶ ورق اوسط پر شائع ہوتا ہے۔ خط و کتابت ... بنام مسز بیڈلی ... اس اخبار کو ... ۵ مارچ ۱۸۸۴ء کو پادری کریون نے جاری کیا تھا

۴۰۲ رفیق دکن — حیدر آباد دکن، ماہواری، ۲۴ ورق خورد ... مہتمم عزیز الدین ... یکم اگست ۱۸۸۴ء

۴۰۳ رونق ہند — کانپور، ماہواری ... ۸ ورق خورد، ناگری مشترک ... مالک گنگا پرشاد ... یکم جون ۱۸۸۳ء

۴۰۴ **روداد مدرسہ اسلامی**، دیوبند، ضلع سہارنپور... ۳۷ ورق خورد... مہتمم مدرسہ مولوی رفیع الدین... ۱۸۶۷ء

۴۰۵ **رتن پرکاش** رتلام، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط... مجاریہ محمد حسین، مہتمم مولوی عبدالحق... ۱۸۶۸ء

۴۰۶ **راوی بے نظیر** لاہور... ۱۸ ورق خورد ماہواری... مالک ساالک رام... ایڈیٹر پنڈت شیوناتھ... یکم فروری ۱۸۸۴ء

۴۰۷ **راوی** لاہور... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد، مہتمم پنڈت ہرگوپال... ۱۹ اپریل ۱۸۸۷ء

۴۰۸ **رعنا** لکھنؤ... ماہواری... ۱۰ ورق... مالک سید عاشق حسین عاشق... یکم اکتوبر ۱۸۸۳ء

۴۰۹ **رفیع الاخبار** بنارس... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد... مالک سید غلام حسین... ایڈیٹر کریم بخش...... دوسرا نام اس کا دائی ہند ہے... یکم جنوری ۱۸۸۴ء

۴۱۰ **ریختہ** دہلی... پندرہ روزہ... ۴ ورق اوسط... مالک مہانرائن... ۱۸۸۲ء

۴۱۱ **روشنی** لاہور... ہفتہ وار، ۴ ورق خورد... مالک شیر محمد... اجراء و اشتہار ۱۰ مارچ ۱۸۸۷ء

۴۱۲ **رشید** کراچی... ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں... مالک مشہدی مرزا محمد صادق خلف مرحوم آقا مرزا مخلص علی اثنا عشری... زبان فارسی... ۱۱ جولائی ۱۸۸۷ء

۴۱۳ **روزانہ** پہلے یہ اخبار ۲ ورق اوسط... بایڈیٹری محمد علی خاں عرشی انوار الاخبار کے نام... سے جاری ہو کر ۱۱ جون ۱۸۸۵ء سے ادنیٰ قیمت پر ورق کلاں پر روزانہ ہو گیا... مالک حاجی تیغ بہادر، مہتمم فتح محمد تائب... ۱۸۷۴ء

۴۱۴ **زبدۃ الاخبار** آگرہ، ہفتہ وار، ۴ ورق... ۸ نومبر ۱۸۵۳ء

۴۱۵ **زبدۃ النظائر** پہلے... ہفتہ وار، ۶ ورق خورد... فرخ آباد... بنواری لال مہتمم... اب ۹ ورق خورد... رگھوبیر دیال وکیل کے اہتمام سے، مرتبہ بی، ٹی، اس۔ بلینکی واسٹریچی... بیرسٹران و مترجمہ شیو سہائے منصف... یکم جنوری ۱۸۸۱ء

۴۱۶ **زینت الاخبار** گورکھپور... ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط... مالک کشوری موہن چٹرجی... یکم فروری ۱۸۸۵ء

۴۱۷ **زمانہ** آگرہ... ماہواری، ۲۰ ورق اوسط... مالک خواجہ یوسف علی... جنوری ۱۸۸۱ء

۴۱۸ **زراعت** بجنور، ماہواری، ۱۰ ورق خورد... مہتمم پنڈت سری لال... یکم مارچ ۱۸۸۴ء

۴۱۹ **زمیندار** ضلع گوجرانوالہ بمقام فیروزوالہ... فن زراعت و فلاحت و باغبانی و تخلیندی و علاج المویشی و صنعت و حرفت و تجارت کا ماہوار رسالہ، ۲۵ ورق خورد... مہتمم مفتی محبوب عالم۔ اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۶ء۔

۴۲۰ **سانڈرس گزٹ** شاہ جہاں پور۔ پندرہ روزہ، ۴ ورق اوسط... مالک سید اصغر علی... ایڈیٹر غلام حسین خاں یکم جنوری ۱۸۶۰ء

۴۲۲ **سبھا کپور تھلہ** کپور تھلہ۔ مجاریہ دھرم بردائی سبھا بحکم دیوان متھرا داس۔۔ ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔۔ ایڈیٹر برکت علی۔۔۔ ۱۸۶۹ء

۴۲۳ **ستارۂ ہند** پہلے یہ چندوسی ضلع مراد آباد۔۔۔ بان شمبھو ناتھ و کھرام سیٹھ، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔۔ بعدازاں ۲ رمئی ۱۸۸۲ء کو۔۔۔ مراد آباد میں آ گیا۔ مالک پنڈت بنواری لال۔۔۔ ۱۸۸۱ء

۴۲۴ **ستارۂ ہند** آگرہ کا اخبار، اجراء اشتہار، جنوری ۱۸۸۷ء

۴۲۵ **ست پرکاش** بانس بریلی، ۴۰ ورق خورد۔ مہتمم کشن لال۔۔ یکم جنوری ۱۸۸۳ء، مشرقی علوم کا ماہوار رسالہ ناگری مشترک۔

۴۲۶ **ست سماچار** فتح گڑھ، پندرہ روزہ، اردو ناگری مشترک۔۔ مہتمم شیو پرشاد۔۔۔ یکم جولائی ۱۸۸۳ء

۴۲۷ **سٹوڈنٹس ٹیچر** لاہور۔۔۔ ماہواری، ۲۲ ورق خورد۔۔ مالک اوتم چند کپور۔۔۔ یکم نومبر ۱۸۸۴ء

۴۲۸ **سٹوڈنٹس گائیڈ** لاہور، ماہواری، ۱۲ ورق خورد۔۔۔ مالک ہر بھگت سنگھ۔۔۔ اشتہار یکم نومبر ۱۸۸۵ء

۴۲۹ **سمیع** مدراس۔۔۔ مالک نواب سمیع الملک رستم الدولہ شیر افگن خاں بہادر خاں باز جنگ۔ یکم جنوری ۱۸۸۰ء

۴۳۰ **سحر سامری** لکھنؤ۔۔۔ ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔ مالک پنڈت بچا نتھ۔۔۔ ایڈیٹر منشی کر دیال فرحت۔ یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء

۴۳۱ **سحر آفریں** میسور علاقہ بھرت پور، ماہواری، ۱۰ ورق خورد۔۔۔ مالک نظام الدین شوقی یکم ستمبر ۱۸۸۶ء

تحسین سروری

اُردُو ادب کے غیر ادبی مآخذ

(۱۱)

اویماقِ مغل

اویماقِ مغل[1] فارسی زبان میں تاریخ و سوانح کے موضوع پر ایک نہایت کارآمد و مستند کتاب ہے۔ اور جیسا کہ سرِ ورق پر صراحت کر دی گئی ہے، یہ کتاب "احوالِ سلاطینِ عظام و اقوام و خاندان ہائے خوانین کے لئے مخصوص ہے۔ اقوامِ مغل کی تاریخ، ان کے عادات و خصائل، ان کی اصل و نسل اور محاربات وغیرہ پر فارسی، اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں موجود ہیں، لیکن اویماقِ مغل جیسی مبسوط و مفصل کتاب شاید ہی کوئی اور ہو۔

۸۳۲ صفحات کی یہ کتاب ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں مطبع روز بازار امرتسر میں چھپ کر شائع ہوئی۔ شروع میں ۲۰ صفحات کی فہرست مضامین ہے۔ اس کے بعد ساتویں صفحے سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ کتاب دو ابواب پر تقسیم کی گئی ہے۔ بابِ اول میں اقوامِ مغل کا بیان ہے۔ اس باب کا خاتمہ صفحہ ۱۰۰ پر ہوتا ہے۔ دوسرے باب کی ابتدا صفحہ ۱۰۱ سے ہوتی ہے۔ صفحہ (۸۱۵) سے مولف نے اپنے حالات اور اس کتاب کی ترتیب کی روداد قلم بند کی ہے۔

مولف چونکہ سونکھرہ ضلع مندسور (مالوہ) کے ساکن تھے اس لئے انہوں نے آخر میں خاندان روسائے سونکھرہ کا تذکرہ بھی لکھا ہے۔

مرزا عبدالقادر خان خود آقا باش قاچار نسل سے تھے، اس لئے اقوامِ مغل کی تاریخ لکھنے میں انہوں نے کافی محنت و خلوص سے کام لیا ہے۔ مغل، ترک، تاتار، تورانی اور ایرانی نسلوں اور ان کی شاخوں کی تفصیل سے تاریخ لکھی ہے۔ اور ان اقوام کے سلاطین و روٗسا اور معروف و غیر معروف شخصیات کے حالات بیان کرنے میں موٗلف نے کافی تحقیق سے کام لیا ہے، جہاں جہاں یہ قوم پہنچی اور جن جن طریقوں سے تسخیرِ ممالک میں انہماک دکھایا، وہ سب کچھ اس کتاب میں ہے۔

کتاب کے مولف نے باب دوم سے ہر مغل بادشاہ کے حالات بیان کرنے کے بعد اس کے آخر میں "ذکر بعضے از شعرائے عہد او" کے عنوان سے ایک فصل قائم کی ہے۔ جس کے تحت خاص خاص شعرا کا مختصر تذکرہ ہے۔ ان شعرا میں درباری وغیر درباری کی کوئی تخصیص نہیں رکھی۔ سب سے پہلے تذکرہ شعرا کا سلسلہ "ذکر شوکت و عظمت خاندانِ عباسیہ" سے شروع کیا گیا ہے۔ اور سب سے آخر کا تذکرہ "شعرائے ذکر سلطنت سلطان محمد شاہ ابن عباس مرزا ابن فتح علی شاہ قاچاری

[1] مصنف: مرزا محمد عبدالقادر خاں عرف مرزا محمد آغا جان

کے تحت ہے۔

- تذکرۂ شعراء کے کل (۲۲) مقامات ہیں۔ جب مغلوں نے ہندوستان کو تسخیر کر لیا، اور ان کی سلطنت کو یہاں استحکام حاصل ہو گیا، ان کے درباروں میں فارسی وزن کی شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ لہٰذا ہندوستان میں عہد بابری کے شعراء سے تذکرۂ شعراء کا سلسلہ قائم ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد کے شعراء کے تذکرے پر اس کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ذیلی زمانوں کے ایسے شعراء کا تذکرہ ہے جو ہندوستان میں موجود تھے۔

آخری زمانے کے اردو شعراء کا تذکرہ بھی ہے، لیکن ان کو فارسی گو کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور نمونہ کلام بھی فارسی ہے۔

اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ کے تحت میرا خیال ہے کہ کم از کم عہد اکبری کے فارسی شعراء کو بھی اس فہرست میں شامل کر لینا چاہئے۔ اس لئے کہ زبان اردو کی تاریخ کی ابتدا صحیح معنوں میں اسی عہد سے ہوتی ہے۔ نیز اس عہد کی فارسی نظم و نثر میں اردو کے کچھ کچھ آثار ملتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ جنوبی ہند میں اردو زبان دکنی کے روپ میں ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ والئ گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ اور بیجاپور کے علی عادل شاہ (ثانی) اور ان کے درباری شعراء اور انشاپرداز اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر نمایاں کر رہے تھے۔ ادھر شمالی ہند کی اردو الگ انداز میں ترقی کر رہی تھی۔ بکٹ کہانی کے مصنف محمد افضل (وفات ۱۰۳۵ھ) اور بعض اور شعراء کے شمالی ہند کے متعلق یہ سراغ ملتا ہے کہ وہ عہد اکبری میں گزرے ہیں۔

اسکے علاوہ اس عہد کے فارسی گویوں کی نشاندہی اسلئے ضروری ہے کہ جو اصحاب علم اس موضوع پر کام کر رہے ہوں ان کیلئے بھی یہ سلسلہ کارآمد ہو سکے۔

اس تمہید کے بعد اب میں شعراء کی فہرست پیش کرتا ہوں۔

شعرائے عہد اکبری:

(۱) ملک الشعراء ابوالفیض فیضی فیاضی ابن شیخ مبارک اکبرآبادی ص ۴۳۱
(۲) شیخ ابوالفضل علامی ابن شیخ مبارک ص ۴۳۲
(۳) میر حیدر رفیعی معمائی کاشی ص ۴۳۳۔
(۴) شیخ عبدالقادر بدایونی ص ۴۳۳۔
(۵) نظری کشمیری ص ۴۳۳۔
(۶) علی قلی بیگ انیسی شاملو ص ۴۳۳۔
(۷) امیر قاضی اسیری طہرانی خلف قاضی مسعود حسینی ص ۴۳۳۔
(۸) محمد اصغر منشی اشرف خان اشرف مشہدی ص ۴۳۳
(۹) باقی کولابی۔ ص ۴۳۳

(۱۰) تقی الدین محمد خزانی اصفہانی ص ۴۳۳۔

(۱۱) روغنی استرآبادی ص ۴۳۳۔

(۱۲) پیر محمد خان غزنوی ص ۴۳۳۔

(۱۳) میر معیث الدین محوی ہمدانی ص ۴۳۴

(۱۴) قاسم خان موجی بدخشی ص ۴۳۴۔

(۱۵) میر محسن رضوی محسن مشہدی ص ۴۳۴۔

(۱۶) عبدالعلی محوی ص ۴۳۴

(۱۷) جلبی بیگ فارغ تبریزی تلمیذ خواجہ افضل الدین اصفہانی ص ۴۳۴

(۱۸) نیدی شیرازی ص ۴۳۴

(۱۹) مشفقی ہروی (در بخارا متولد) ص ۴۳۴

(۲۰) عبدالغنی ہمدانی ص ۴۳۴۔

(۲۱) محمد رحیم عہدی ص ۴۳۴

(۲۲) فیروز کابلی ص ۴۳۴

(۲۳) عبیدی ص ۴۳۴

(۲۴) مرزا لعل بیگ لعلی ولد شاہ قلی سلطان بدخشی ص ۴۳۴

(۲۵) لوائی پیرزادہ سبزوار ص ۴۳۴

(۲۶) مستغنی کشمیری (مولداً لاہوری) ص ۴۳۴

(۲۷) مولوی مشہدی ص ۴۳۴

(۲۸) ناصر ترمذی معروف بہ سید شاہ ناصر ص ۴۳۴

(۲۹) قوسی از تربیت یافتگان خان کلاں ص ۴۳۵

(۳۰) خواجہ مجد الدین مجد خوافی ص ۴۳۵

(۳۱) منظری سمرقندی ص ۴۳۵

(۳۲) قندی از مداحان محمد بیرام خان ترکمان ص ۴۳۵

(۳۳) علی ابن ملا درویش ذوقاقی فتحپوری ص ۴۳۵

(۳۴) سرمدی اصفہانی (چوکی نویس اکبری) ص ۴۳۵

(۳۵) سید حسن نثاری از سادات بخارا ص ۴۳۵

(۳۶) سید عزیز خان عزیز مخاطب بہ خان اعظم ص ۴۳۵

(۳۷) یوسف محمد خان یوسفی ابن خان اعظم تکہ خان ص ۴۳۵

(۳۸) زین خان کوکہ۔ ص ۴۳۵

(۳۹) یوسف محمد یوسفی کابلی ص ۴۳۵

(۴۰) کاہی ص ۴۳۵

(۴۱) حیدری تبریزی ص ۴۳۶

(۴۲) سنجر کاشانی پسر حیدر معمائی ص ۴۳۶

(۴۳) سلطان سبلکی ص ۴۳۶

(۴۴) غزالی مشہدی ص ۴۳۷

(۴۵) الفتی یزدی ص ۴۳۷

(۴۶) ثروتی سمرقندی ص ۴۳۸

(۴۷) محمد رضا شکیبی صفاہانی ص ۴۳۸

(۴۸) حیاتی گیلانی ص ۴۳۹

(۴۹) نوعی جنوشانی ص ۴۳۹

(۵۰) نوعی اصفہانی ص ۴۴۰

(۵۱) میر محمد شریف وقوعی نیشاپوری از سادات اسحٰق آباد نیشاپور ص ۴۴۰

(۵۲) ہاشم قندھاری ص ۴۴۰

(۵۳) جمال الدین عرفی شیرازی ص ۴۴۰

(۵۴) نورالدین ظہوری ترشیزی ص ۴۴۱

(۵۵) ملک قمی ص ۴۴۱

(۵۶) قاسم ارسلان ص ۴۴۲

(۵۷) ملا شیرازی لاہوری ص ۴۴۲

(۵۸) ملک محمود گجراتی ص ۴۴۲

(۵۹) رہائی ص ۴۴۲

(۶۰) سید محمد فکری (جامہ باف) ص۴۴۲

(۶۱) میر دردی ص۴۴۲

(۶۲) سید محمد نجفی ص۴۴۲

(۶۳) مرزا قلی میلی ص۴۴۲

(۶۴) ملا طریقی ص۴۴۲

(۶۵) ملا متقی بخاری ص۴۴۲

(۶۶) ملا صبوحی ص۴۴۲

(۶۷) حزنی ساوجی ص۴۴۲

(۶۸) عبداللہ رازی ص۴۴۲

(۶۹) میر معصوم از سادات صفویہ ص۴۴۲

(۷۰) ہجری ص۴۴۳

(۷۱) لطفی ص۴۴۳

(۷۲) نویدی ص۴۴۳

(۷۳) یور قلی آہنی ص۴۴۳

(۷۴) بادشاہ قلی حزنی ص۴۴۳

(۷۵) امیر سید علی منصور جدائی ص۴۴۳

(۷۶) قدری شیرازی ص۴۴۳

(۷۷) تشبیہی کاشی ص۴۴۳

(۷۸) فراری گیلانی برادر حکیم ابوالفتح ص۴۴۳

(۷۹) ملا عزتی شیرازی ص۴۴۳

(۸۰) امیر خسروی خواہر زادۂ قاسم گنابادی ص۴۴۳

(۸۱) فہمی طہرانی ص۴۴۳

(۸۲) ملا سہی بخاری ص۴۴۳

(۸۳) ملا نیازی سمرقندی ص۴۴۳

(۸۴) منظری کشمیری ص۴۴۳

(۸۵) میر حاج بیگ ص۴۴۳

(۸۶) محمد صالح دیوانہ ملقب بہ عاقل ص۴۴۳

(۸۷) ملا علی احمد (مہرکن) ص۴۴۳

(۸۸) ہاشم (قصہ خوان) ص۴۴۴

(۸۹) ملا بقائی ص۴۴۴

(۹۰) ملا مستی ص۴۴۴

(۹۱) شریف فارسی ولد خواجہ عبدالصمد شیریں قلم ص۴۴۴

(۹۲) تقی الدین محمد ششتری ص۴۴۴

(۹۳) ملا خافی ص۴۴۴

(۹۴) ملا واقی ص۴۴۴

(۹۵) محمد رضا ص۴۴۴

(۹۶) بقائی ص۴۴۴

(۹۷) معصوم ولد قاضی ابوالمعالی ص۴۴۴

(۹۸) میر رکن الدین ص۴۴۴

(۹۹) میرزا بیگ شہری ص۴۴۴

(۱۰۰) ملا خورد فنائی ص۴۴۴

(۱۰۱) میر عزیز اللہ عزیزی (از سادات) ص۴۴۴

(۱۰۲) ابن علی واثقی ص۴۴۴

(۱۰۳) میر امانی ص۴۴۴

(۱۰۴) عزتی بخاری ص۴۴۴

(۱۰۵) خواجہ حسین ثنائی مشہدی ص۴۴۴

(۱۰۶) خواجہ حسین مروی ص۴۴۴

(۲) شعرائے عہد جہانگیری: (ان میں بعض شعراء کا تعلق عہد اکبری سے بھی رہا)

(۱) طالب آملی ص۴۸۴

(۲) نظیری نیشاپوری ص۴۸۵

(۳) سعیدائے زرگر باشی گیلانی ص۴۸۶

(۴) حکیم مسیح الزماں رکنا کاشی (از حکمائے عہد اکبری بود) ص۴۸۶

(۵) حیاتی کاشی (از شعرائے عہد جہانگیر بادشاہ) ص۴۸۶

(۶) تقی از شعرائے (عصر جہانگیری است) ص۴۸۶

(۷) میرزا احسن اللہ احسن مخاطب بہ ظفر خان ص۴۸۷

(۸) میر عماد الدین محمود الٰہی تخلص از سادات ہمدان (در عہد جہانگیر بادشاہ بہند آمدہ) ص۴۸۷

(۹) قلیچ خان الفتی (از امرائے پنج ہزاری بود) ص۴۸۷

(۱۰) اسد بیگ اسد قزوینی (مدتے در ملازمت جہانگیر بادشاہ بسر برد و خطاب پشیتر و خان یافت) ص۴۸۷

(۱۱) رائے منوہر توسنی ولد رائے لون کرن کچھواہہ والی سانبھر بود (اکبر بادشاہ او را خطاب مرزا منوہر دادہ بود) ص۴۸۷

(۱۲) محمد رضا شکیبی ابن خواجہ عبداللہ صفاہانی ص۴۸۷

(۱۳) صادق پسر میرزا صالح (از علمائے بلاد ہند آموختہ و در سلک ملازمان جہانگیر بادشاہ منسلک بود) ص۴۸۷

(۱۴) محمد بیگ فسونی (در عہد اکبری بہ ہند رسید) ص۴۸۷

(۱۵) میر محمد حسین فغفوری لاہیجی (در فن طبابت و شعر و خوشنویسی دستگاہے لائق داشت) ص۴۸۷

(۱۶) شاہ پور از اولاد مولانا امیدی طہرانی (اول فریبی تخلص میکرد) ص۴۸۷

(۱۷) مرشد یزدی جردی ص۴۸۸

(۱۸) عالم بیگ سروری کابلی (در اردوے جہانگیری بسر می برد) ص۴۸۸

(۱۹) سیرابی (در عہد جہانگیر بادشاہ وارد ہندوستان گردید) ص۴۸۸

(۲۰) مرزا غازی ترخان وقاری ابن مرزا جانی ترخان (از قوم ترخانی والی ٹھٹھہ و سندھ از کبار امرائے جہانگیر بادشاہ بود) ص۴۸۸

(۲۱) ملکی از شعرائے آں زمان بود ص۴۸۸

و دیگر شعرائے عہد جہانگیری بسیار اند کہ ذکر مجموع دریں مقام موجب طوالت می شود لہٰذا ہمیں قدر اکتفا رفت۔

(۳) شعرائے عہد ہمایوں بادشاہ ۔

(۱) ملک الشعرا ابو طالب کلیم کاشانی (بعہد جہانگیر بادشاہ در ہند آمدہ) ص۵۰۸

(۲) حاجی محمد جان قدسی مشہدی ص۵۰۸

(۳) شیدا فتح پوری (مولد او فتح پور است و اصل او از طایفہ نکلو بود) ص۵۱۱

(۴) سعیدائے گیلانی (مخاطب بہ بے بدل خان بود و از عہد جہانگیر تا در شاہجہانی داروغہ زرگر خانہ طلائی بود) ص۵۱۱

(۵) صیدی طہرانی ص۵۱۲

(۶) میرزا محمد علی صائب تبریزی (ملک الشعراء و امام الفضلا بود) ص۵۱۲

(۷) میرزا حسن بیگ رفیع قزوینی ص۵۱۳

(۸) میر رضی دانش رضوی مشہدی ص۵۱۳

(۹) فروغی کشمیری (از خوش طبعان کشمیر بود) ص۵۱۴

(۱۰) باقیائی نائینی (در عہد جہانگیری وارد ہندوستان شدہ در بنارس بود) ص۵۱۴

(۱۱) میر یحیائی کاشی شیرازی ص۵۱۵

(۱۲) محمد قلی سلیم کاشی طہرانی (از اتراک بود مخاطب بہ اسلام خان گشت) ص۵۱۵

(۱۳) سالک ایزدی (اول بہ دکن آمدہ چندے نزد قطب شاہ ماندہ از انجا بدہلی رسید) ص۵۱۵

(۱۴) شیخ محمد علی اکبرآبادی (ہندو پسرے بود بشرف اسلام مشرف شدہ) ص۵۱۵

(۱۵) سعید خان قریشی (نام او شیخ محمد است) ص۵۱۵

(۱۶) محسن فانی (از شعرائے شاہجہانی بود) ص۵۱۶

(۱۷) محمد طاہر غنی (تلمیذ محسن فانی است) ص۵۱۶

(۱۸) محمد افضل سرخوش (از مردم سرکار عبداللہ خان بود است) ص۵۱۷

(۱۹) مرزا محمد طاہر آشنا (مخاطب بہ عنایت خان بن ظفر خان صوبہ دار کشمیر بود) ص۵۱۷

(۲۰) حکیم حاذق پسر حکیم ہمام گیلانی ص۵۱۷

(۲۱) شادمان (از سلطان زادہائے قوم گکھر است) ص۵۱۷

(۲۲) طغرا مشہدی ص۵۱۷

(۲۳) معبد (اصلش از بلخ است) ص۵۱۷

(۲۴) میر معصوم پسر میر حیدر معمائی ص۵۱۷

(۲۵) میرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خان واضح ص۵۱۷

(۲۶) وفا ہروی ص۵۱۷

(۲۷) قاسم خان جوینی ص۵۱۷

(۲۸) قاسم دیوانہ مشہدی (از اصفہان بہندوستان رسید شاگرد صائب) ص۵۱۷

(۲۹) مرزا عبدالغنی قبول کشمیری (شاگرد میرزا داراب جویا) ص۵۱۸

(۳۰) گرامی (خلف و شاگرد میر عبدالغنی قبول است) ص۵۱۸
(۳۱) سید عبدالقادر قابلی بلگرامی ص۵۱۸
(۳۲) نسبتی فارسی ص۵۱۸
(۳۳) میر جملہ (بمنصب بخشیگری شاہ جہاں بادشاہ سرافراز بود آخر ترک دنیا کردہ) ص۵۱۸
(۳۴) حسینی مشہدی (ملازم شاہ جہاں بادشاہ بود) ص۵۱۸
(۳۵) محمد تقی واقف (ابن خواجہ محمد از معززین عہد شاہ جہاں بادشاہ بود) ص۵۱۸
(۳۶) ملا درویش واکہ ص۵۱۸
(۳۷) متھراداس ہندو ص۵۱۸
(۳۸) شاہ بلند اقبال شاہزادہ دارا شکوہ قادری (خلف اکبر شاہ جہاں بادشاہ بود و مرید ملا شاہ خلیفہ شاہ میر لاہوری) ص۵۱۸

(۴) شعرائے عہد عالمگیر بادشاہ۔

(۱) میرزا روشن ضمیر ص۵۵۳
(۲) میر ابوتراب بیضا ص۵۵۳
(۳) علی سرہندی (ناصر علی) ص۵۵۳
(۴) نعمت خان عالی (شیرازی الاصل بود) ص۵۵۴
(۵) میر عبدالجلیل الحسینی الواسطی بلگرامی ص۵۵۵
(۶) میر عسکری رازی مخاطب بہ نواب عاقل خان (از سادات خواف) ص۵۵۵
(۷) میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (اصل او از نژاد برلاس است) ص۵۵۶
(۸) ملا محمد سعید اشرف پسر محمد صالح مازندرانی ص۵۵۶
(۹) محمد رضا ہمدانی (مخاطب بہ قزلباش خان) امید ص۵۵۶
(۱۰) سید معزالدین موسوی خان فطرت (از سادات قم) ص۵۵۶
(۱۱) حکیم سعید سرمد سعید از حکیم سعید ارمنی (فرنگی بود) ص۵۵۶
(۱۲) میرزا ابوتراب جودت بدخشانی ص۵۵۷
(۱۳) میر محمد زمان راسخ ص۵۵۷
(۱۴) حاجی محمد اسلم سالم کشمیری ص۵۵۷

(۱۵) حکیم کاظم حسین صاحب ص۵۵۶

(۱۶) حاجی صادق صامت اصفہانی ص۵۵۶

(۱۷) صابر از سادات ردار دہ است ص۵۵۶

(۱۸) محمد طاہر طاہر ص۵۵۶

(۱۹) شیخ عبدالعزیز عزت اکبر آبادی ص۵۵۶

(۲۰) میر عبدالرحمٰن گرامی (مخاطب بہ وزارت خان ص۵۵۸

(۲۱) نسبتی تھانیسری ص۵۵۸

(۲۲) میر محمد مراد لایق جون پوری ص۵۵۸

(۲۳) معین الدین نازکی ص۵۵۸

(۲۴) محمد اکرم غنیمت (کنجاہی) ص۵۵۸

(۲۵) آقا محمد امین وفا ص۵۵۸

(۲۶) ذکی (ہندوئے بود) ص۵۵۹

(۲۷) احمد یار خان یکتا (برلاس) ص۵۵۹

(۲۸) حافظ عبدالرحیم کم گو (کشمیری) ص۵۵۹

(۵) شعرائے عہد شاہ عالم بہادر شاہ (اول)

(۱) سید حسین مخاطب بہ امتیاز خان خالص صفاہانی ص۵۶۳

(۲) میر ابوالحسن شیرازی مخاطب بہ قابل خان ص۵۶۳

(۶) شعرائے عہد جہاں دار شاہ ابن شاہ عالم بہادر شاہ۔

(۱) میر محمد حسین ایجاد سامانوی (خطاب معنی یاب خان) ص۵۷۹

(۲) میرزا مقیائی بخاری ص۵۸۰

(۳) میر عظمت اللہ بے خبر خلف میر لطف اللہ معروف بہ شاہ لدھا الحسینی الواسطی ص۵۸۰

(۴) میر عبدالجلیل حسینی بلگرامی ص۵۸۰

(۵) شیخ حسین شہرت ص۵۸۲

(۶) فضل علی خان ص۵۸۲

(۷) میر محمد حسین ناجی ص۵۸۲

(۸) میر محمد ہاشم جرأت مخاطب بہ موسوی خان ص۵۸۳

(۷) شعرائے عہد روشن اختر محمد شاہ بادشاہ

(۱) محمد یوسف نجمت برہانپوری (خطاب سخنور خان) ص۶۲۲

(۲) سید محمد معصوم دیدان ص۶۲۲

(۳) میر محمد علی رائج (سیالکوٹی) ص۶۲۲

(۴) حکیم بیگ خان حاکم ص۶۲۲

(۵) شیخ محمد علی حزیں اصفہانی ص۶۲۲

(۶) اسحاق خان شوستری مخاطب بہ موتمن الدولہ ص۶۲۳

(۷) درگاہ قلی خان درگاہ ص۶۲۳

(۸) ہنرور خان عاقل شاہجہاں آبادی ص۶۲۳

(۹) سید قریش بلگرامی عجیب (برادر خالہ زاد عبدالجلیل بلگرامی) ص۶۲۳

(۱۰) آنند رام مخلص چھتری (لاہوری) شاگرد مرزا بیدل ص۶۲۳

(۱۱) شیخ سعد اللہ گلشن دہلوی ص۶۲۳

(۱۲) نواب شکر اللہ خان خاکسار ص۶۲۳

(۱۳) متین اصفہانی ص۶۲۴

(۱۴) سراج الدین علی خان آرزو ص۶۲۴

(۱۵) میر رضی اقدس شوستری ص۶۲۴

(۱۶) میرزا علی نقی ایجاد (از قوم قاچار) ص۶۲۴

(۱۷) نواب آغر خان دیدہ ص۶۲۴

(۱۸) فقیر اللہ آفرین ص۶۲۴

(۱۹) رافع از شعرائے کشمیر ص۶۲۵

(۲۰) میر جعفر راہب اصفہانی ص۶۲۵

(۲۱) امام قلی امام ص۶۲۵

(۲۲) میر تقی خیال (مصنف بوستان خیال) ص۶۲۵

---

(۸) شعرائے عہد احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ:۔

(۱) علی قلی خان والہ درغستانی ص۶۴۳

(۲) میر غلام علی آزاد بلگرامی ص۶۴۳

(۳) شیخ نورالعین واقف ص۶۴۴

(۴) مرزا خان رسا ہمدانی ص۶۴۴

(۹) شعرائے عہد عالی گہر شاہ عالم (ثانی) آفتاب تخلص۔

(۱) سید جعفر روحی زیر پوری (قریب بہ لکھنو) ص۶۸۵

(۲) میر جلال الدین غالب (از سادات زید پور) ص۶۸۵

(۳) میر قمرالدین منت ص۶۸۵

(۴) میر محمد تقی عبیر ص۶۸۵

(۵) مرزا محمد فاخر مکین دہلوی ص۶۸۵

(۶) خواجہ میر محمدی درد ص۶۸۶

(۷) میرزا رفیع سودا ص۶۸۶

(۸) سید جان جاناں مظہر دہلوی ص۶۸۶

(۹) شیخ غلام ہمدانی مصحفی ساکن امروہہ ص۶۸۶

(۱۰) میر انشاء اللہ خان انشا ص۶۸۶

(۱۰) شعرائے عہد اکبر شاہ ثانی ابن شاہ عالم (ثانی) وعہد سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر ابن اکبر شاہ (ثانی)

(۱) خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق ص۶۹۲

(۲) مفتی صدرالدین خان آزردہ دہلوی ص۶۹۲

(۳) مولوی امام بخش صہبائی ص۶۹۳

(۴) مولوی عبداللہ خان علوی باشندہ مئو قائم گنج ص۶۹۳

(۵) گل محمد خان ناطق مکرانی ص۶۹۳

(۶) محمد حسین قتیل پسر درگاہی مل کھتری ص۶۹۳

(۷) قاضی محمد صادق خان اختر ص۶۹۳

(۸) درویش علی رسوا خراسانی ص۶۹۳

(۹) منشی نفضل عظیم عظیم بر برادر مولوی فضل حق خیرآبادی ص۶۹۳

(۱۰) حکیم محمد مومن خان مومن دہلوی ص۶۹۳

(۱۱) مرزا اسداللہ خان غالب دہلوی معروف بہ میرزا نوشہ ص۶۹۴

(۱۲) نواب مصطفیٰ خان حسرتی (شیفتہ) ص۶۹۴

(۱۳) خواجہ حیدر علی آتش ص۶۹۴

(۱۴) شیخ امام بخش ناسخ ص۶۹۴

(۱۵) سید محمد خان رند ص۶۹۴

(۱۶) نقیر محمد خان گویا ص۶۹۴

(۱۷) محمد رضا برق ص۶۹۴

(۱۸) خواجہ وزیر۔ ص۶۹۴

(۱۹) سید منظفر علی اسیر ص۶۹۴

(۲۰) منشی امیر احمد امیر مینائی ص۶۹۴

(۲۱) فصیح الملک نواب میرزا خان داغ ص۶۹۵

(۲۲) میر ضامن علی جلال لکھنوی ص۶۹۵

اکثر شعراء کے حالات بہ تفصیل لکھے ہیں، ان کے اعزاز و امتیازات بھی بیان کئے ہیں۔ کسی بادشاہ یا امیر کے دربار سے وابستگی اور ان تک رسائی کے اسباب بھی بیان کئے ہیں۔ اسی طرح مولف نے شعراء کے انتقال کی تاریخ اور ممکن ہوا تو کسی کا قطعہ تاریخ بھی درج کر دیا ہے۔

میرے خیال میں ادبیاتِ مغل میں شعراء کے حالات جتنی تفصیل سے درج ہیں، اتنی تفصیل سے شاید ہی کسی تذکرہ شعراء میں ہو۔

(بقیہ ص۵۷)

اور ۱۲۸۶ھ میں وہ بھی راہیٔ ملک بقا ہوئے حکیم میر محمد جعفر حامی نے کہا ہے ؎

از کمال جبر دیوان سوم ترتیب داد، دید ادبی بعد ازیں در لکھنؤ ترک سخن

اس واضح شہادت کے بعد یہ تسلیم نہ کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ رشک نے عراق کی روانگی کے وقت سے غزل گوئی ترک کر دی تھی ممکن ہے وہاں پہنچ کر سلام وغیرہ لکھتے رہے ہوں۔

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

سحرِ عشق آبادی

بھگوان چند سحرؔ عشق آبادی میرٹھ کے ایک سربرآوردہ بھٹناگر کایستھ خاندان کے جوہر قابل ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۷ ستمبر ۱۹۰۳ء میں عشق آباد (شہر میرٹھ) میں ہوئی۔ آپ کے والد منشی نندلال سرشتہ دار کا شمار میرٹھ کی ممتاز ہستیوں میں تھا۔ سحرؔ عشق آبادی کی ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول میرٹھ میں ہوئی۔ اس کے بعد اور اسکولوں میں پڑھتے رہے۔ اور پھر امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ میں آٹھویں کلاس میں داخل ہوگئے۔ اس اسکول میں آپ کے بڑے بھائی بابو بینی پرشاد بھٹناگر (ڈبل ایم اے ایل ایل بی) ہیڈ ماسٹر تھے اور یہیں مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی اردو ٹیچر تھے۔ یہ ۱۹۲۴ء کا زمانہ تھا۔ اسی وقت سے آپ اپنے مجذوبانہ شعروں پر عزیزؔ صاحب سے اصلاح لیتے رہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بذریعہ مراسلت ہوتا رہا۔ نویں کلاس میں نانک چند ہائی اسکول میرٹھ میں داخل ہوئے اور دسویں تک وہیں تعلیم پائی۔ علاوہ درسی تعلیم کے اردو فارسی کی تعلیم آپ نے اپنے والد محترم سے حاصل کی جو اردو اور فارسی کے جید عالم تھے۔ عربی کی تعلیم آپ نے مولانا مصطفیٰ صاحب سے حاصل کی جو نولکشور پریس میں، تصحیح قرآن و حدیث کرتے تھے۔ قرآن و احادیث مولانا صاحب نے لفظاً لفظاً آپ کو پڑھا دیئے اور سمجھا دیئے۔ زبور توریت انجیل سردھنے جا کر اٹلی کے ایک بزرگ پادری سے پڑھیں۔ علم جوتش پنڈت متھرا پرشاد دہلی بھیت والوں سے حاصل کیا جو اپنے فن میں یکتا تھے۔ لیکن جوتش پر آپ کا یقین بالکل نہیں رہا۔ ابراہیم خلیل اللہ نے فرمایا ہے۔ "لا اُحِبُّ الآفلین" میں ڈوبنے والوں کا یقین نہیں کرتا۔ انہیں کی تائید اسلام نے کی ہے۔ سحرؔ عشق آبادی کے تین شعر اس سلسلے میں ملاحظہ فرمائیے۔

یہ ہے تجربہ اور حساب زمانہ — سر و دو دھار مل فال جوتش قیافہ
نہیں غیب سے کوئی رکھتا علاقہ — نبی اور رشی تک نے پایا نہ شعبہ
خبیر و غنی عالم الغیب تو ہے — جو دعویٰ کرے اس پہ لعنت ہی تو ہے

آپ کی زندہ نشانیاں دو بچیاں ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بیخودؔ دہلوی مرحوم کی طرح کافی وسیع ہے نندلال پروانہؔ کا شمار آپ کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اپنے استاد سے سچی عقیدت رکھتے تھے ان کی وفات سے سحرؔ صاحب کا دل ہی بجھ گیا ہے۔ خوشنویسی کا پیشہ آپ نے ذریعہ آمدنی بنایا کیونکہ اس میں کسی کی ملازمت اور چاکری نہ تھی۔ آپ کی تمام عمر خدمت

ادب یا حصول علم میں گذری ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی پاکیزہ زبان گھری ہوئی کے آپ مداح ہیں اور اسی کا استعمال کرتے ہیں غلط الفاظ یا غلط محاوروں سے آپ گریز کرتے ہیں۔ آپکے انتقادی مضامین جو اکثر "نگار" "لکھنؤ" "ماحول" دہلی "ہماری زبان" علی گڑھ اور دیگر ممالک کے جریدوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب نہیں۔ اگر یہ مضامین کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تو اردو ادب کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوں گے۔

حضرت سحر عشق آبادی کی تصانیف کی فہرست ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) "گلبانگ" مجموعہ ہے جناب سحر عشق آبادی کی نظموں غزلوں اور رباعیوں کا جسے سنگرام پبلشرز گوبند پورہ دتی نے سنہ ۱۹۶۵ء میں کافی اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ مجموعہ ان کے عزیز شاگرد دیپ داس مرحوم کے اصرار سے کسی طرح منظر عام پر آگیا ورنہ اس مجموعہ کے شائع ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ نادرہ سنہ ۱۹۶۰ء کے زمانہ برشگال کی لکھی ہوئی ہے جو تیرہ (۱۳) اوزان اٹھارہ (۱۸) بحور پر مشتمل ہے۔ متفق اور مؤتلف دو دو بحروں میں ہیں۔ لیکن دونوں بحریں ایک دوسرے سے مختلف کیا معنی متضاد ہیں اور ہر عروض کی کتاب لکھنے والا قریب ترین شاعری ہے لیکن ایک شعر دائرہ پر کہیں نظر نہ آسکے گا۔ ان نظموں کو بڑے بڑے اہل نظر صاحبان نے نادرات میں شمار کیا ہے۔ آپ کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اور امید ہے کہ اردو سے ذوق رکھنے والے اس کتاب کی قدر کریں گے۔

(۲) "عیوب فصاحت" آپکی یہ کتاب شعرا اور ادیبوں کے لئے بہت مفید ہے۔ لیکن اب تک شائع نہ ہو سکی ہے۔ اس کتاب میں آپ نے فہرست متروکات کی وجہ ترک دلیلوں کے ساتھ بتائی ہے کیونکہ اب تک فہرست متروکات کی وجہ ترک سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے چشم پوشی کی ہے۔

(۳) "سحر العروض" اس کتاب کے بہت سے مضامین مختلف رسالوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ابھی یہ کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آئی۔

(۴) تاریخی اور دیگر نظمیں غزلیں اور رباعیاں بے ترتیب پڑی ہیں۔ ان کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو سکتا ہے۔

جناب سحر عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں اور آپ کا شمار ہمارے اساتذہ سخن میں ہوتا ہے۔ آپ یک فنی شاعر نہیں بلکہ آپ نے ہر صنف سخن میں فکر سخن کی ہے۔ آپ کی غزلوں میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ پاکیزگی اور فنی پختگی بھی پائی جاتی ہے اور کسی بھی غزل کا ایک شعر ادھر سے ادھر نہیں ہٹایا جا سکتا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

جو فنا فی الحبیب ہوتا ہے　　عشق کو حسن میں سموتا ہے

غیروں سے کیوں راز کی باتیں کہیں　　پوچھیو جو مل جائیں کبھی وہ کہیں

چھایا فضا پر تھا سکون ہی سکون　　اے دل ناداں وہ ملے تھے یہیں

جب جوانی جوش پر آئی تو وہ رخصت ہوئے
زندگی کے قصر کی تعمیر آدھی رہ گئی

چمن کی روح کھنچ آتی نسیم مشکبو ہوتی
جو تم پہلو میں ہوتے قلب کی کیوں آرزو ہوتی

دو عالم رقص میں ہوتے فرشتے وجد میں آتے
جو خلوت میں مری اور آپ کی کچھ گفتگو ہوتی

مجھے آتشِ عشق نے پھونک ڈالا
میں دامن کی تیرے ہوا چاہتا ہوں!

اے شوق! آ اب دید کی آواز دے ذرا
آئینہ تحیر سے ہو گیا انکی نگاہ سے

دم بخود ہوں ایک نامعلوم ادا سے دم بدم
دن دہاڑے لٹ رہا ہے کاروانِ زندگی

ماند ہے کائنات رنگ و بو
وہ نگاہیں ہیں یک بیک معلوم

جو راہِ حق میں خار ہٹا کر بچھائے گل
اس موت کو حیات بنانا ہے تیرا فرض!
دنیا کی آرزو میں تو مرتے ہیں سینکڑوں
اپنے وطن پہ جان کھپانا ہے تیرا فرض
تجھ سے بچھڑ سکے نہ کوئی فرد کارواں
مڑ مڑ کے پیچھے دیکھتے جانا ہے تیرا فرض

حسن کے عالم میں جب عشق نے پرواز کی
مہر فلک سے سوا ذرہ کو اونچا کیا

حسن کی ہر شے حسین ہے مجھ کو یقین ہے
لطف پہ موقوف کیا ستم بھی حسین ہے

ہر جزوِ دل کامل نظر آتا ہے
ہر آئینہ محفل محفل نظر آتا ہے!

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے خاص ایڈیشن

کی چند خصوصیات

یہ لغت اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے تیار ہوئی۔ اس لئے اس کی جامعیت، افادیت اور صحت مطالب کو درجۂ استناد حاصل ہے۔

اس میں انگریزی زبان کے تمام مروجہ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں۔

انگریزی الفاظ کے صرف اردو مترادفات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ضروری جگہوں پر الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انگریزی محاورے یا روزمرہ کے لئے اردو محاورہ یا روزمرہ، انگریزی مثل کے لئے اردو مثل اس طرح درج کی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔

انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو مترادف الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں معانی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آسکے۔ ہر معنی کا فرق مثالیں دیکر واضح کیا گیا ہے۔

باطنی حسن کے ساتھ صوری اعتبار سے بھی خاص ایڈیشن اپنی مثال آپ ہے۔ اسے اعلیٰ درجے کے بائبل پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ یہ کاغذ خاص طور پر اس ایڈیشن کے لئے درآمد کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

محدود تعداد میں شائع کیا گیا ہے اس لئے اپنا نسخہ

جلد از جلد حاصل کرلیں

ایک ساتھ دو نسخے منگوانے پر محصول ڈاک معاف

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

نئی کتابیں

یادگاری مجلہ محفلِ قرأت

جنوری ۱۹۶۶ء میں کراچی میں ایک بین الاقوامی محفل قرأت منعقد ہوئی تھی، اس موقع پر مجلس استقبالیہ نے بیش نظر یادگاری مجلہ شائع کیا تھا۔ شروع میں تحریک قرأت و تجوید کا تعارف کرایا گیا ہے اور اس قسم کی محافل کی غرض و غایت اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پاکستان کے مشہور قاری محمد الیاس صاحب کا ایک مقالہ "علم قرأت اور تجوید — تاریخ کی روشنی میں" اور محافل قرأت کی اہمیت" کے عنوان سے قاسمی برادران کا ایک مضمون شامل ہے قاری محمد الیاس صاحب کا مقالہ نہایت محققانہ اور بڑی افادیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ دوسرا مضمون بھی افادیت سے خالی نہیں ہے

اس مجلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے، وہ سورہ فاتحہ اور چند آیات قرآنی کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ سید محمد اُدیس صاحب نے کیا ہے۔

اردو میں قرآن مجید کے بہت سے ترجمے ہو چکے ہیں، جو اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ایک ترجمہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس میں عربی زبان، خصوصاً قرآن مجید کے اس آہنگ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جو قرآن مجید کا ہر قاری اور ہر سامع محسوس کرتا ہے اور قاری یا سامع کی عربی زبان سے عدم واقفیت کے باوجود اسے مسحور کر دیتا ہے اور قرآن مجید کی اثر آفرینی عربی زبان سے واقفوں کے محدود حلقے سے نکل کر نہ صرف عام مسلمانوں پر بلکہ غیر مسلم سامعین پر بھی ایک وجد کی کیفیت اور بے خودی طاری کر دیتی ہے۔ سید محمد ادیس صاحب نے ترجمے میں قرآن مجید کے اصل آہنگ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے دیگر ترجموں کے مقابلے میں اس کی اثر آفرینی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ترجمے میں یہ کمال اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب عربی اور اردو، دونوں زبانوں کی نفسیات سے گہری واقفیت ہو اور ان پر عبور ہو۔ ترجمہ دیکھ کر فاضل مترجم کی دونوں زبانوں پر قدرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

سورہ فاتحہ کے ترجمے میں، اردو تراجم کے ابتدائی دور ہی سے ایک غلطی چلی آرہی ہے جو یہ ہے کہ سورۃ کی آخری آیات "اہدنا الصراط المستقیم...... ولاالضالین" میں "المغضوب علیہم" اور "الضالین" کو دو فرقے سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ یہ "الذین انعمت علیہم" کی توصیف مزید ہے۔ یعنی "ان لوگوں کے راستے کی طرف ہدایت فرما جن کو تو نے نعمتیں

بخشی ہیں اور جن پر تیرا نہ تو غضب ہوا اور جو گمراہ بھی نہیں تھے۔" عام مترجمین اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ "الذین انعمت علیہم" سے علیحدہ دو گروہ ہیں اور ان سے مقصود یہود و نصاریٰ ہیں۔ فاضل مترجم نے یہ غلط فہمی رفع کرنے کے لئے نہ اس کی تفسیر کی ہے نہ کوئی حاشیہ لکھا ہے۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ترجمے کے چند لفظوں ہی میں اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے۔ سید محمد اویس صاحب کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

دے ہم کو ہدایت سیدھے رستے کی،
رستہ ان کا بخشیں نعمت جن کو،
جن پہ غضب تیرا نہ ہوا،
اور جو گمراہ نہیں!

اگر اس زبان، اس اسلوب نگارش اور صوتی آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے پورے قرآن مجید کا ترجمہ شائع ہو جائے تو یہ بڑی خدمت ہو گی۔

جاگ رہا ہے پاکستان

مرتب:۔ ادریس صدیقی • صفحات:۔ ۴۵۶ قیمت: سات روپے ناشر: اردو اکیڈمی سندھ کراچی

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق ادبی تحریروں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ ادبی محاذ پر ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے جو قلمی جنگ لڑی تھی، وہ ہماری ادبی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ ہماری قومی تاریخ کا بھی ایک درخشاں باب ہے۔ اس قسم کی تحریروں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں "جاگ رہا ہے پاکستان" نظموں اور گیتوں کا مجموعہ ہے، جس میں تقریباً تین سو شاعروں کی تخلیقات جمع کر دی گئی ہیں۔ مرتب نے حتی الامکان تمام اخبارات و جرائد کو سامنے رکھا ہے۔ اس سعی و تلاش کے نتیجے میں یہ مجموعہ تیار ہوا ہے جسے ہر اعتبار سے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق منظومات کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ مرتب نے تخلیقات کے انتخاب میں خاصی وسیع القلبی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بآسانی اس مجموعے کی ضخامت کو کم کر سکتے تھے لیکن اس طرح ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس مجموعے میں تقریباً سبھی شاعروں کو جگہ مل گئی ہے۔ اور یوں آئندہ ایک اچھا انتخاب شائع کرنے کے لئے سارا بنیادی مواد ایک جگہ جمع ہو گیا ہے۔ ناشر نے اس کتاب کو بڑے سلیقے سے چھاپا ہے، ایسی خوبصورت کتابیں اردو میں کم ہی شائع ہوتی ہیں۔

ابوسلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

عنوانات

ادبیات اردو ۔ تحقیق و تنقید
اردو زبان اور اس کے مسائل
تاریخ و سیاسیات
تعلیم
خود نوشت
شخصیات
اقبال
دیگر شخصیات
صحافت
کتابیات و کتب خانے
فنون لطیفہ
لسانیات
مذہبیات
تفسیر قرآن مجید
سنت و سیرت نبوی
مسائل و مباحث
مکاتیب

پیش نظر اشاریے کی ترتیب میں ماہ دسمبر ۶۶ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل اخبارات و رسائل سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ ادب لطیف لاہور نومبر دسمبر ۶۶ء ماہنامہ ثقافت لاہور دسمبر ۶۶ء ماہنامہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۶۶ء
" ادبی دنیا " " " جامعہ دہلی " " " میثاق لاہور " "
" اردو ادب علی گڑھ ۶۶ء شمارہ (۲) " جام نو کراچی " " " نقش کراچی نومبر دسمبر "
" اردو ڈائجسٹ لاہور دسمبر ۶۶ء " چراغ راہ " " " " نئی قدریں حیدرآباد دکن دسمبر "
" اردو زبان سرگودھا نومبر دسمبر " " زاویے حیدرآباد " " " نیرنگ خیال لاہور نومبر دسمبر "
" اردو نامہ کراچی دسمبر " " زندگی رام پور " " " ہندستانی ادب حیدرآباد دکن دسمبر "
" افکار " " " " ساقی کراچی نومبر دسمبر " ہفت روزہ المنبر لائل پور " "
" البلاغ بمبئی " " " سب رس حیدرآباد دکن دسمبر " " جہاں نما لاہور " "
" الشجاع کراچی " " " سیارہ لاہور " " " چٹان "
" انجمن اسلامیہ میگزین " " نومبر دسمبر " صبح امید بمبئی " " " شہاب لاہور " "
" صحیفہ اہل حدیث " " دسمبر " " طلوع اسلام لاہور نومبر دسمبر " " صدق جدید لکھنؤ " "
" آجکل دہلی اکتوبر تا دسمبر " " عالمی ڈائجسٹ کراچی دسمبر " " تنزیل لاہور " "
" برہان " " دسمبر " " فاران " " " " لاہور " " "
" بینات کراچی " " " فروغ اردو لکھنؤ " " " ہماری زبان علی گڑھ " ۔ ۔ ۔
" تجلی دیوبند " " " قومی زبان کراچی " " روزنامہ انجام کراچی جمعہ وار ایڈیشن
" تحریک دہلی " " " کتاب لاہور " " " جنگ " "
" ترجمان القرآن لاہور " " " " لکھنؤ " " " حریت " "
" تہذیب الاخلاق " " " " کتابی دنیا کراچی

ادبیات اردو ـــــ تحقیق و تنقید

تھیپے، پی کے		
ایم ایچ پرکار (مترجم)	امبر شیخ مراٹھی کا رزمیہ شاعر	صبح امید، ص ۲۸ تا ۳۰، دسمبر
احتشام احمد ندوی، سید	دیار دکن ادبی آئینہ میں	سب رس، ص ۳ تا ۱۱، "
احمد رفاعی	ذوق کی قصیدہ نگاری	قومی زبان، ص ۴۱ تا ۵۰، "
اختر، ملک حسن	تنقید اور تخلیق	ادب لطیف، ص ۶۹ تا ۷۳، نومبر دسمبر
اختر، وحید	بیالیس نظمیں (کلیم الدین احمد) ایک تبصرہ	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ + ۱۲، ۲۲ر دسمبر
اسلم، ایم	ادب اور ادبی اکھاڑے	ساقی، ص ۵ تا ۸، دسمبر
اشتیاق اظہر	ایک قدیم مشاعرہ (زیر اہتمام مسلم کلب کانپور ۱۹۳۲ء)	اردو زبان، ص ۱۵ تا ۲۴، نومبر دسمبر
انجم اعظمی	دیباچہ عشق	افکار، ص ۱۱ تا ۱۳، دسمبر
بختیاری، قیصر حسین خاں	بہار کے غیر درسی ادب کا مسئلہ	ساقی، ص ۳۱ تا ۳۲ + ۴۴، دسمبر
بسمل، راجیندر ناتھ	جگر بریلوی کی غزل	اردو ادب، ص ۵ تا ۴۰،
بومیرے، عبدالحمید	ادھورے خاکے (کلام شرف کمالی)	صبح امید، ص ۱۲ تا ۲۲، نومبر
بیگم افضل اعظمی	فنکار اور مصلح نذیر احمد میں تصادم	افکار، ص ۲۰ تا ۲۶، دسمبر
جائسی، کبیر احمد	حافظ بحیثیت فرد	ادبی دنیا، ص ۴۸ تا ۵۸، نومبر دسمبر
جعفری، ڈاکٹر محمد یونس	خواتین کی کہاوتیں	ساقی، ص ۵۳ تا ۶۳، دسمبر
حسن، ڈاکٹر محمد	نیاز کا ادبی مرتبہ	کتاب لکھنؤ، ص ۱۳ تا ۱۸، "
حسین، ڈاکٹر رفیق	سید محمود کی دو نظمیں ـ تہذیب الاخلاق میں	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۵ر دسمبر
حیدری، کرم	ادب کی دوامی اقدار	ادبی دنیا، ص ۱۷ تا ۲۷، نومبر دسمبر
حیال امروہوی	جدید شاعری ادب اور ابہام	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۲، ۵ر دسمبر
خیام، اے	حمید کاشمیری کا فن	نئی قدریں، ص ۳۵ تا ۳۹،
دارا، پروفیسر محمد طفیل	مثنوی خواب و خیال	تہذیب الاخلاق، ص ۶۹ تا ۷۳، دسمبر
سبزواری، ڈاکٹر شوکت	داغ حسرت (مجموعہ کلام شفقت کاظمی)	ادبی دنیا، ص ۳۵ تا ۳۸، نومبر دسمبر
سروری، عبدالقادر	پنڈت سالک رام سالک کشمیری کی داستان جگت روپ	آجکل، ص ۱۴ تا ۱۹، دسمبر

سلام سندیلوی، ڈاکٹر	فطرت حسن اور شاعری	اردو زبان، ص ۱۰ تا ۱۴، نومبر دسمبر
شیخ، ثاقب	کیا اسٹیج ڈراما ترقی پذیر ہے	نیرنگ خیال، ص ۷ تا ۸، " "
صالحہ عابد حسین	ناول — زندگی کی تصویر، تعبیر و تفسیر	آجکل، ص ۱۱ تا ۱۴، اکتوبر
صدیقی، حبیب احمد	کیا مولانا ابوالکلام آزاد کی اردو ٹکسالی ہے؟ [1]	فروغ اردو، ص ۳ تا ۲۵، دسمبر
صدیقی، شکیل احمد	غالب کی فارسی شاعری	نیرنگ خیال، ص ۹ تا ۱۶، نومبر دسمبر
صغیر بلگرامی	مثنوی عبرت الناظرین	قومی زبان، ص ۵۱ تا ۶۴، دسمبر
عابدی، ڈاکٹر سید امیر حسن	نظیر اکبرآبادی اور سبک ہندی	" " ۶۵ تا ۸۴، "
عارف، اخلاق حسین	ثاقب لکھنوی اور ان کی ادبی محفلیں	آجکل، ص ۲۷ تا ۳۳، اکتوبر
عارفی، امیر	ترانۂ علی گڑھ یونیورسٹی کا خالق - اشتیاق بحیثیت فن کار	صبح امید، ص ۱۱ تا ۲۶، دسمبر
عاشق ہرگانوی، مناظر	مختصر افسانے کی تکنیک	جام نو، ص ۲۳، دسمبر
عباس، اصغر	زبان گل سے حسن یار کی تفسیر	ہماری زبان، ص ۴ تا ۷، ۲۲ دسمبر
عرش ملیح آبادی، محمد علی	عہد اورنگ زیب کی ایک اردو نظم	قومی زبان، ص ۵ تا ۲۰، دسمبر
عزیز حاصل پوری	حضرت سلطان باہو اور ان کا عارفانہ کلام	ادبی دنیا، ص ۱۴ تا ۲۴، نومبر دسمبر
عطا کاکوی	دو آتشہ شاد	آج کل، ص ۲۰ تا ۲۸، نومبر
عقیل، ڈاکٹر سید محمد	امانت کی اندر سبھا	ساقی، ص ۴۴ تا ۵۲، دسمبر
فاضلی، فدا	جدید اردو شاعری اور ایک شام	کتاب لکھنؤ، ص ۴۹ تا ۵۴، "
فخر دہلوی، پروفیسر افتخار احمد	جگر مرادآبادی، فن، شخصیت اور شاعری	فاران، ص ۲۶ تا ۳۲، "
فراق گورکھپوری	جدید اردو شاعری	کتاب لکھنؤ، ص ۷ تا ۸، "
فرحت قمر	عشق — ماضی، حال، مستقبل	آجکل، ص ۲۴ تا ۲۶، اکتوبر
کمال، عبدالعزیز	اثر صہبائی — شاعر پاک ہیں	ادبی دنیا، ص ۶۵ تا ۷۴، نومبر دسمبر
کندیانی، امجد	سب رس کا تنقیدی جائزہ	اردو نامہ، ص ۴۴ تا ۳۴، دسمبر
مدنی، ڈاکٹر ظہیرالدین	ہندوستان ادب میں "ایسے" (ESSAY)	ہندوستانی ادب، ص ۳ تا ۹، "
مظہر، محمد رمضان	ساحر صدیقی مرحوم کی یاد میں مشاعرہ	چٹان، ص ۱۷، ۵ دسمبر

[1] منقول از نیا دور، لکھنؤ

منچری، رفیعہ شبنم	راجندر سنگھ بیدی اور ایک چادر میلی سی	صبح امید، ص ۵ تا ۱۸، دسمبر
منہاس، کسریٰ	آئینِ وفا — ڈاکٹر سید صفدر حسین کے مرثیہ پر ایک نظر	ادب لطیف، ص ۶۵ تا ۶۸، نومبر دسمبر
"	ظرافت اور ظریف لکھنوی	ادبی دنیا، ص ۸۱ تا ۹۴، " "
نذیر احمد، پروفیسر	عرش نگاری کا فن افسانہ نگاری	نئی قدریں، ص ۳ تا ۱۹،
نصرت قریشی	ظرف غزل	فاران، ص ۴۰ تا ۴۲، دسمبر
نعمانی، احمد اسحاق	شبلی کی محرومیاں	الشجاع، ص ۴۴ تا ۵۰، "
نیر، ڈاکٹر حکم چند	نوادر بنارس	اردو ادب، ص ۵۷ تا ۷۴،
———	تخلیق و تنقید میں اشتراک کی نوعیت	تحریک، ص ۵ تا ۱۷، دسمبر

اردو زبان اور اس کے مسائل

اختر صدیقی، سفیر	لندن میں اردو	ہماری زبان، ص ۸ ، ۲۲ دسمبر
افتخار حسین، آغا	چیکوسلوواکیہ میں اردو	افکار، ص ۱۴ تا ۱۹، دسمبر
بخاری، ڈاکٹر سہیل	اردو زبان کی پیدائش اور تاریخ	اردو زبان، ص ۸ تا ۹، نومبر دسمبر
بوہیرے، عبدالحمید	ہماری سماجی و سیاسی زندگی پر اردو کا اثر	صبح امید، ص ۴ تا ۵، دسمبر
چغتائی، محمد اکرام	اردو، یعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق	اردو نامہ، ص ۲۷ تا ۳۳، "
سعد، ابراہیم	اردو میں قانونی کتب	کتاب لاہور، ص ۲۳ تا ۴۴، "
صارم الازہری، عبدالصمد	اردو کے نام	ادبی دنیا، ص ۲۹ تا ۳۴، نومبر دسمبر
معین الرحمٰن، سید	انجمن ترقی اردو	کتاب لاہور، ص ۴۷ تا ۵۲، دسمبر
مفتون کوٹوی	راجستھان میں فروغ اردو کا صد سالہ جائزہ	اردو ادب، ص ۷۵ تا ۱۰۰،

تاریخ و سیاست

ابو اللیث، ڈاکٹر	تاریخ تصوف کا ایرانی اور ہندی پس منظر	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۹ تا ۱۸، نومبر دسمبر
ابو سلمان شاہجہانپوری	انقلاب — حقیقت و مقاصد کی روشنی میں	چٹان، ص ۱۳ + ۱۴، ۱۹ دسمبر
اختر، شیر محمد	قائد اعظم اور عوام	قندیل، ص ۳ ، ۵ دسمبر
اسرار احمد، ڈاکٹر	تحریک جماعت اسلامی — نقش غزل (۲)	میثاق، ص ۳۳ تا ۵۶، دسمبر

اوج، حبیب اللہ	جنگ آزادی سے حصول آزادی تک	جہاں نما، ص ۴۷ تا ۴۸، ۱۴ اگست
اکبرآبادی، خواجہ طہارت حسین	مسلمانان ہند کا سیاسی ارتقار	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۴۱ تا ۴۴، نومبر دسمبر
بلگرامی، سبط اصغر	کراچی ـــ قائد اعظم کا شہر	عالمی ڈائجسٹ، ص ۵۵ تا ۵۹، دسمبر
جعفری، رئیس احمد	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں [1]	انجام، ص ۱۲، ۱۰ دسمبر
"	عربوں کی فکری تخلیقات	ثقافت، ص ۱۱ تا ۲۷، دسمبر
حامدی، خلیل	الاخوان المسلمون (۳)	ترجمان القرآن، ص ۳۷ تا ۴۸، دسمبر
حیدر راؤ، ممتاز	کشمیر ـــ ایک جائزہ	جہاں نما، ص ۱۱ تا ۱۴، ۳۰ اکتوبر
خلیل اللہ، پروفیسر محمد	علاقائی تعاون برائے ترقی (پاکستان ایران اور ترکی کا اتحاد)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۶۵ تا ۸۷، دسمبر
خورشید، عبدالسلام	مشرقی اور مغربی پاکستان میں یگانگت کی تخلیق	جہاں نما، ص ۱۶ تا ۱۷، ۱۱ ستمبر
خورشید عالم	چین کا عالمی کردار (۱)	طلوع اسلام، ص ۴۶ تا ۷۰، دسمبر
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب [2]	جنگ، ص ۱۲، ۳ دسمبر
رضوی، سید امیر حیدر	میکاولی اور اس کا فلسفہ وسیاست	شہاب، ص ۸ + ۹، ۲۵ دسمبر
رضوی، سید قاسم	قائد اعظم اور حیدرآباد دکن [3]	جہاں نما، ص ۲۷ تا ۲۸، ۳۰ اکتوبر
شہابی، مفتی انتظام اللہ	دہلی کی علمی داستان	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۵۶ تا ۶۰، نومبر دسمبر
عالم، انوار	ذہنی الجہاد اور سبیل الفکر (محمود احمد عباسی کے انداز فکر و تحقیق پر ایک جنبش قلم)	فاران، ص ۵ تا ۲۰، دسمبر
عبدالرحمان، سید صباح الدین	آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا ۲۳واں اجلاس	معارف، ص ۴۶۹ تا ۴۷۴، "
عبداللہ، پروفیسر محمد	حاجی شریعت اللہ اور فرائضی تحریک	سیارہ، ص ۶۲ تا ۷۶، "
عظمی ملک	تحریک پاکستان کی نامور خواتین	جہاں نما، ص ۸۴ تا ۹۶، ۱۴ اگست

---

[1] دیگر اقساط کے لئے دیکھئے انجام ۱۷، ۲۴ و ۳۱ دسمبر ۷۰ء

[2] ملکی اور عالمی سیاسی مسائل پر تبصروں کا مستقل سلسلہ ہر جمعہ کی اشاعت میں دیکھئے۔

[3] دیگر اقساط کے لئے دیکھئے جہاں نما ۱۸ اور ۲۵ دسمبر

عاقل علی خاں، محمد	جمہوریت اور رائے عامہ	آجکل، ص ۳۲ تا ۳۵، نومبر
فاروق، شریف	وزیر خارجہ پیرزادہ شریف الدین سے خصوصی انٹرویو	جہاں نما، ص ۳۷ تا ۴۳، ۱۸ر ستمبر
قریشی، پروفیسر شبیر حسین	قائداعظم کی سیاسی زندگی	جنگ، ص ۲، ۲۶ر دسمبر
قریشی، فاروق حسن	ہمارا قومی تصور اور قائداعظم محمد علی جناح	حریت، ص ۲ + ۱۱، ۲۶ر "
صادق کاشمیری	لاہور کے عجائب گھر	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۲ + ۱۷، ۲۷ر دسمبر
کشفی، میر غلام احمد	قائداعظم اور عالم اسلام	قندیل، ص ۱۲ + ۲۰، ۲۵ر دسمبر
سلیم کیانی	اخوان المسلمون	جہاں نما، ص ۱۸ تا ۲۰، ۱۱ر ستمبر
لودھی، نبی احمد	قبرص (سیاسی حالات)	" " ۲۱ تا ۲۴، ۱۶ر اکتوبر
م - ش	ایک قصہ پارینہ (نہرو رپورٹ اور اس کے بعد)	" " ۳۲ تا ۳۳، ۱۲ر اگست
" "	جب قائداعظم مسٹر محمد علی جناح تھے	" " ۱۲ تا ۱۳، ۲۸ر "
" "	" " "	" " ۳۰ تا ۳۱، ۲۵ر ستمبر
" "	ملی جدوجہد کے چند اوراق	" " ۳۴، ۲ر " ۱۱ر "
گوپال متل	ہسپانوی نوآبادیوں کی تحریک آزادی	تحریک، ص ۴، دسمبر
" "	" " "	المنبر، ص ۵، ۱۳ر "
محمد احمد، سید	سزائے موت عہد قدیم سے عہد جدید تک	عالمی ڈائجسٹ، ص ۲۸ تا ۳۱، دسمبر
محمود الرحمان (پرویز کاکوی)	قائداعظم ــ عظیم آباد میں	جنگ، ص ۲۷ر دسمبر
محمود علی حکیم	سنسکرت پر مسلمانوں کے احسان	تہذیب الاخلاق، ص ۸ تا ۱۱، دسمبر
مرتضیٰ، حافظ غلام	قرون وسطیٰ میں عرب و ہند کے سیاسی تعلقات	معارف، ص ۴۲۴ تا ۴۳۵، "
میر، وارث	ترکیہ ــ پاکستان کا عظیم حلیف	جہاں نما، ص ۱۷ تا ۱۹، ۲۶ر اکتوبر
" "	ہوچی منہ اور کاؤر کی شخصیتوں کے پس منظر میں	" " ۱۹ تا ۲۲، ۱۲ر اگست
نظامی دہلوی، خواجہ حسن	میں دلی ہوں	ہندوستانی ادب، ص ۱ تا ۲۰، دسمبر
	افریقہ میں مسلمانوں کا حال	ترجمان القرآن، ص ۵۴ تا ۶۲، "
نعمت اللہ خاں	دارا شکوہ اور اکبر	چٹان، ص ۸ + ۱۴، ۱۷ر دسمبر

تعلیم

احسان اللہ	پنجاب میں ورٹنری کالج	ہماری زبان، ص ۷، یکم دسمبر

ادیب، سید مسعود حسن رضوی	مدرسہ قیصریہ مٹیا برج کلکتہ بناکردہ واجد علی شاہ	ہماری زبان، ص ۲، یکم دسمبر
حامد الحسینی، مولانا مشتاق احمد	آزاد ہندوستان میں مذہبی تعلیم کا مسئلہ	البلاغ، ص ۳ تا ۱۳، دسمبر
″ ، مولانا احمد حسین	التحصیل والتکمیل (۲)	″ ″ ۱۴ تا ۲۳، ″
گاڈکر، ایس کل	جامعہ کا خطبہ کانووکیشن (۱۹۷۷ء)	جامعہ، ص ۲۸۳ تا ۲۹۰، ″
ولی بخش قادری، عبداللہ	جامعہ اور اساتذہ کی تربیت	″ ″ ۳۰۳ تا ۳۰۹، ″

خودنوشت

جگت سنگھ، سردار	میری زندگی	جامعہ، ص ۲۲۰ تا ۲۲۲، دسمبر

شخصیات

اقبال

اقبال	خطوط اقبال	ادبی دنیا، ص ۹ تا ۱۴، نومبر دسمبر
جوہر، نربھے رام	اقبال اور مرد مومن	ساقی، ص ۱۲ تا ۳۲، دسمبر
رفعت، علی احمد	اقبال اور فرید	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۵ر ″
سعدی، حافظ محمد اسعد	اقبال اور علم معاشیات	چٹان، ص ۱۳ تا ۱۴، ۲۲ر ″
ممتاز حسن	اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے	نقش، ص ۹ تا ۲۵، نومبر دسمبر
محمود حسین، ببر	علامہ اقبال کی داستان دکن (۲)[1]	صبح امید، ص ۸ تا ۱۴، دسمبر

دیگر شخصیات

ابوسلمان شاہجہانپوری	محمد علی جناح ـ پیکر حق و صداقت	جنگ، ص ۷، ۲۴ر دسمبر
احمد، رضوان	قائد اعظم ایک وکیل کی حیثیت سے	حریت، ص ۳، ۲۴ر ″
احمد، سید رشید	ایک مسلم رام بھگت قدیم صوفی شاعر ـ علاء الدین وصالی	جامعہ، ص ۲۹۱ تا ۳۰۲، دسمبر

---

[1] ماہنامہ سب رس حیدرآباد سے نقل کیا گیا۔

ادیب، پروفیسر اولیا احمد	قائداعظم کی تقریریں اور ان کے معاشی پہلو	جنگ، ص ۱۰، ۲۶ر دسمبر
ادیب، ڈاکٹر سید لطیف حسین	شیخ علی بخش بیمار	معارف، ص ۴۳۴ تا ۴۴۸، دسمبر
ارشاد احمد خاں	قائداعظم — جی الانا سے ایک ملاقات	انجام، ص ۵، ۲۶ر دسمبر
اسحاق، محمد	امام سفیان ثوری	ثقافت، ص ۴۴ تا ۵۲، دسمبر
اسلام، حافظ محمد	سید حسین شہید سہروردی	جنگ، ص ۲، ۵ر دسمبر
اسلم حیات، ملک	آغا شورش کاشمیری	چٹان، ص ۴، ۱۲ر "
اصفہانی، ایم اے ایچ	قائداعظم	انجام، ص ۲، ۲۶ر "
اعظمی، عبداللطیف	جامعہ اور اس کے طلبا قدیم	جامعہ، ص ۳۱۸ تا ۳۲۰، دسمبر
البنا، حسن معروف شاہ طہیری (مترجم)	مذاکرات حسن البنا، (۲)	چراغ راہ، ص ۱۷ تا ۲۴، دسمبر
الحسینی، حکیم مختار	قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم	چٹان، ص ۶، ۱۷ر دسمبر
انور صدیقی	جامعہ (ملیہ اسلامیہ دہلی) کی کچھ ممتاز ادبی شخصیتیں	جامعہ، ص ۳۱۰ تا ۳۱۷، دسمبر
آغا، ڈاکٹر وزیر	شاد امرتسری	اردو زبان، ص ۳ تا ۷، دسمبر
بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین	مولانا صلاح الدین احمد	ادبی دنیا، ص ۱۲۹ تا ۱۳۱، نومبر دسمبر
بدایونی، یعقوب	ایک گمنام شاعر — جناب وحشی شاہجہانپوری	ہماری زبان، ص ۴ تا ۷، ۱۵ر دسمبر
بولا بھٹو، ہیکٹر زبیر صدیقی (مترجم)	قائداعظم کا بچپن	جنگ، ص ۲۶ر دسمبر
حسرت کاسگنجوی	قرۃ العین حیدر	نئی قدریں، ص ۴۰ تا ۴۴، "
" "	عزیز احمد (ناول نگار)	سب رس، ص ۱۲ تا ۱۳، دسمبر
خلیل، وقار	ڈاکٹر زور کی یاد میں	قومی زبان، ص ۳۳ تا ۴۰، "
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	قائداعظم......	انجام، ص ۵ تا ۶، ۲۶ر "
دت، اندرجیت	حسرت دیدار باقی ہے — راجہ مہدی علی خاں	سب رس، ص ۲۲ تا ۲۶، دسمبر
ذکار الرحمان	شکیب جلالی کی موت — ایک لمحہ فکریہ	ادب لطیف، ص ۵ تا ۶، نومبر دسمبر
رضوی، ڈاکٹر حسین	قائداعظم	جنگ، ص ۶، ۲۶ر دسمبر
سروش، رفعت	میرا دوست — مجاز	ساقی، ص ۳۳ تا ۵۲، دسمبر

مصنف	عنوان	ماخذ
شامی، مجیب الرحمان	قائداعظم کی باتیں — میجر جنرل اکبر خاں سے ایک ملاقات	حریت، ص ۱۷+۱۲، ۲۳ر دسمبر
شریف حیدرآبادی، ایم	گلبدن بیگم	چٹان، ص ۸+۱۸، ۱۹ر دسمبر
شیرازی، سید معروف شاہ	اخوان المسلمون کے مرشد عام حسن	چراغ راہ، ص ۱۰ تا ۱۳، دسمبر
طاہر قدوائی، ڈاکٹر عقیل	شوق قدوائی	قومی زبان، ص ۱ تا ۱۳، "
عمران خاں، حکیم مولانا محمد	مولانا حیدر علی ٹونکی	برہان، ص ۳۵۳ تا ۳۶۳، "
فاضل لکھنوی، مرتضی حسین	طالب انصاری بدایونی	ادبی دنیا، ص ۹۵ تا ۱۰۲، نومبر دسمبر
فخر الزماں، ڈاکٹر امانی	دسویں صدی ہجری کے دور جانی	معارف، ص ۴۰۸ تا ۴۳۷، دسمبر
فرقان، عظیم الرحمان	پاکستان کے پہلے وزیراعظم (لیاقت علی خاں)	جہاں نما، ص ۲۳ تا ۲۵، ۲۰ر اکتوبر
" "	ڈاکٹر سید عبداللہ	" ، ۲۰ تا ۲۲+۲۴، ۲۳ر اکتوبر
قادری، پروفیسر اطہر	کیپٹن قمر صدیقی مرحوم	جام نو، ص ۱۵ تا ۲۲، دسمبر
قادری، مولانا حامد حسن	حیران شکوہ آبادی	قومی زبان، ص ۹ تا ۱۴، "
قریشی، ڈاکٹر وحید	قائداعظم کی سوانح	کتاب لاہور، ص ۳۷ تا ۴۱، "
کالے، شبیر احمد	سر جگدیش چندر بوس	آجکل، ص ۳۷ تا ۴۰، نومبر
گوپال، مدن	پریم چند کی زندگی کے حالات	" " ۱۱ تا ۱۹، "
محمور جارچوی، ممتاز حسن	حسین شہید سہروردی کی سیاسی زندگی کا آخری دور	جنگ، ص ۱۹، ۵ر دسمبر
مزمل الرحمان	ایک عالم ایک مجاہد — جمال الدین افغانی	" " " ، ۱۷ر "
ملسیانی، جوش	داغ کے نام ور شاگرد	آجکل، ص ۲۳ تا ۲۶، دسمبر
میر، وارث	بابائے قوم — بانی پاکستان	جہاں نما، ص ۲۰ تا ۲۳، ۱۷ر اگست
ناز، ایم ایس	قائداعظم	قندیل، ص ۲+۲۰، ۲۵ر دسمبر
نجید، حمید اصغر	آہ — میاں محمد شفیع مرحوم	چٹان، ص ۷، ۲۴ر دسمبر
نیروا سطی پروفیسر حکیم	امیر البحر عروج باربروسہ	جہاں نما، ص ۴۶ تا ۴۹، ۱۷ر اکتوبر
مختلف ادیب و اکابر[1]	قائداعظم	انجام، ص ۲ تا ۱۱+۱۷+۲۱، ۲۲ر دسمبر

---

[1] نسیم شاد، فاروق پراچہ، لطیف رضوی، جمیل الدین احمد، بیگم نصرت عبداللہ ہارون، حاتم علوی، مناظر صدیقی، حامد حسین آزاد صاحبان کے مضامین یا انٹرویو

ہاشمی، سید نورالحسن	مفتی انوار الرحمان (- ایک صحافی)	جہاں نما، ص ۸۳ تا ۹۳، ۱۸ ستمبر
یورش، قمر	آتش نوا شاعر استاد دامن	چٹان، ص ۹، ۲۲ دسمبر
ــــــــ	مشاہیر اولیاء ہند و پاکستان	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۷۹ تا ۱۱۲، نومبر دسمبر
ــــــــ	گلیلیو گلیلی	عالمی ڈائجسٹ، ص ۴۳ تا ۸۳، دسمبر
ــــــــ	حکیم محمد سعید دہلوی	شہاب، ص ۱۳، ۲۵ دسمبر

صحافت

ذاکرہ غوث	مطلع الاخبار ــ مدراس کا ایک صدی پیشتر کا اخبار	اردو ادب، ص ۱۶۷ تا ۱۷۳،
فضل المتین، سید	اختر شیرانی کا "رومان"	" " ۱۰۱ تا ۱۱۶،
م۔ش	خبر کہاں سے لاؤں؟ (ایک صحافی کی زندگی)	جہاں نما، ص ۴۳ تا ۶۵، ۱۴ اگست

کتابیات و کتاب خانے

ابوسلمان شاہجہاں پوری	نئے خزانے (مئی ۷۵ء کے اخبارات و رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان کراچی، ص ۵۸ تا ۱۰۴، دسمبر
اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو	کتب خانوں کی اہمیت	" " ۴۳ تا ۴۶، "
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا (اشاریہ معارف اعظم گڑھ)	برہان، ص ۳۶۰ تا ۳۷۹، دسمبر
خورشید، انیس	مشرقی پاکستان کے کتب خانے	کتابی دنیا، ص ۵ تا ۱۰، "
سخاوت مرزا	مثنوی پدم راؤ کدم راؤ	اردو ادب، ص ۱۴۳ تا ۱۶۵،

فنون لطیفہ

جیت لال، اندر	جدید فن مصوری پر ایک نظر	ادب لطیف، ص ۵۹ تا ۶۴، نومبر دسمبر

لسانیات

جینا بڑے، علاء الدین	مرہٹی لغات	صبح امید، ص ۱۵ تا ۱۷، نومبر
سبزواری، ڈاکٹر شوکت	اشتقاقیات	اردو نامہ، ص ۷۸ تا ۸۸، دسمبر

سخاوت مرزا	فارسی و اردو کی ایک قدیم لغت	اردو نامہ، ص ۴۴ تا ۴۹، دسمبر
صدیقی، آنسہ شاہدہ تسنیم	اردو کی آوازیں	" " ۸۲ تا ۸۶، "
قدرت نقوی، سید	تحقیق الفاظ	" " ۷ تا ۲۲، "
ادارہ	اردو لغت مجمل ایڈیشن قسط نمبر ۲۰	" " ۳۷۹ تا ۳۹۲، "

مذہبیات

تفسیر قرآن مجید

اصلاحی، مولانا امین احسن	تفسیر سورہ آل عمران (۱۲)	میثاق، ص ۱۱ تا ۲۵، دسمبر
" "	مقدمہ (تفسیر قرآن) نمبر ۳	" " ۱ تا ۱۰، "
بھٹی، محمد جمیل	قرآن اور جغرافیہ	جنگ، ص ۱۲، ۱۳ر "
دریابادی، مولانا عبدالماجد	سورہ ملک (نمبر ۵)	صدق جدید، ص ۴ تا ۵، ۱۷ر "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	تفہیم القرآن - سورہ الطور (۲) والنجم	ترجمان القرآن، ص ۲۷ تا ۴۳، دسمبر

سنت و سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

الاصفہانی، حافظ ابوالشیخ	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات، ص ۱۱ تا ۱۴، دسمبر
انور شاہ، مولوی محمد	تاریخ حدیث و علم اصول حدیث	" " ۳۳ تا ۴۸، "
حسن عباس رضوی و محمد فضل قدیر ندوی	نبی اور رسول	طلوع اسلام، ص ۵ تا ۱۷، دسمبر
شفیع احمد، ابوسلمہ	مسند احمد	برہان، ص ۳۲۵ تا ۳۴۰، "
عبدالستار، مولانا	نصرة الباری شرح صحیح البخاری	صحیفہ اہل حدیث، ص ۹، ۱۲ تا ۳۶، ۱۵/۱ر دسمبر
"	"	" ۷، ۳۳ تا ۳۴/۱۲، ۱۶ر "

مسائل و مباحث

افضل خاں، مولانا محمد	اسلام کا اجتماعی نظام	صحیفہ اہل حدیث، ص ۱۳ تا ۱۷، ۱۶ر دسمبر
الجیری، مولانا عبدالغفار	اسلام کی تعلیم	" " ۱۲ و ۱۷، ۱۵ر "
امام الدین رام نگری، حافظ ابومحمد	تناسخ یا تماسخ	تجلی، ص ۷۲ تا ۹۹، دسمبر

امیر حمزہ شامی، صاحبزادہ محمد	وحدت الوجود اور مظاہر پرستی	سیارہ/ص ۴۱ تا ۴۸/ دسمبر
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان/ص ۳۴۱ تا ۳۵۳/ "
پرویز	مفسدین کا انجام	طلوع اسلام/ص ۴۶ تا ۵۷/ "
پھلواروی، شاہ محمد جعفر	طلاق مسکراں	ثقافت/ص ۳ تا ۱۴/ "
زبیری، ڈاکٹر احمد	خدا ہندوستانی کلچر میں (۲)	زندگی/ص ۴۵ تا ۵۰/ "
شریف محمد	دیار حبیب کی باتیں	المنبر/ص ۳ تا ۱۱/ ۱۰ر "
صدیقی، نجات اللہ	شرکت و مضاربت کے شرعی اصول	زندگی/ص ۹ تا ۴۲/ دسمبر
طفیل، ایم	اسلام کا معاشی نظام	چٹان/ص ۹ تا ۱۳/ ۱۲ر "
عبدالمجید، ابو عبیدہ	مکہ معظمہ اور ہندوستان کی تاریخوں میں فرق اور رویت ہلال کی حقیقت	برہان/ص ۳۶۳ تا ۳۷۰/ دسمبر
کٹرپوری، غلام رسول	حضرت شاہ کٹرپوری کا مسلک	سب رس/ص ۲۷ تا ۳۴/ "
کمال، ڈاکٹر احمد حسین	کچھ اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں	شہاب/ص ۸ تا ۱۰/ ۱۱ر دسمبر
کمال مبارکپوری، مولانا خالد	حج بیت اللہ	البلاغ/ص ۳۲ تا ۷۲/ "
گذدر، ایم ڈبلیو	فقہ حنفی کی خصوصیات	ثقافت/ص ۱ تا ۲۴/ "
مسعود، خالد	زکوٰۃ	میثاق/ص ۲۶ تا ۳۲/ "
وحیدالدین خاں	اسلام اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ	ثقافت/ص ۲۳ تا ۵۴/ دسمبر

مکاتیب

امتیازالدین	مولوی محمد بشیرالدین کے نام مہدی افادی کا ایک غیر مطبوعہ خط	ہماری زبان/ص ۳ تا ۴/ یکم دسمبر
شریف الحسن	چند اور خطوط (ہاشمی فریدآبادی مرحوم)	اردو نامہ/ص ۵۰ تا ۸۱/ دسمبر

Regd. S. No. 1136
Monthly QAOMI ZABAN Karachi

مدیر: مشفق خواجہ
محمد مصلح الدین سعدی کے زیر اہتمام انجمن پریس سے شائع ہوا۔